زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ اشراق

مارچ 2025ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ
امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد۳ شمارہ۳ مارچ ۲۰۲۵ء رمضان ۱۴۴۶ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

معاون مدیر: شاہد محمود

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

احکام شریعت کی غرض وغایت — سید منظور الحسن — 3

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 243-253 (19) — جاوید احمد غامدی — 6

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 11

مقامات

اضطراری علم — جاوید احمد غامدی — 13

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش		
شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (20)	سید منظور الحسن	19
آثارِ صحابہ		
اہل بیت کرام کی تعظیم و توقیر (6)	ڈاکٹر عمار خان ناصر	25
نقطۂ نظر		
مذہبی شناختیں، تاریخی صورت حال اور درپیش چیلنجز	ڈاکٹر عمار خان ناصر	31
فکری گم راہی کے اسباب (1)	محمد حسن الیاس / شاہد رضا	35
مختارات		
روزہ اور برکاتِ روزہ	مولانا امین احسن اصلاحی	43
قاری یا صاحبِ قرآن	محمد ذکوان ندوی	54
سیر و سوانح		
حیاتِ امین (19)	نعیم احمد بلوچ	63
علامہ الطاہر بن عاشور: حیات اور علمی خدمات	غطریف شہباز ندوی	70
وفیات		
زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا!	سید منظور الحسن	74
ادبیات		
ترا وجود نظر کی تلاش میں ہے ابھی	جاوید احمد غامدی	80
حالات و وقائع		
خبر نامہ "المورد امریکہ"	شاہد محمود	81

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں
عالمِ نو ہے، ترے قلب و نظر تازہ کریں

سید منظور الحسن

احکام شریعت کی غرض و غایت

انسان کا نصب العین دار الآخرت ہے۔ یہ امن و سلامتی کا جہان اور ابد الآباد کی بادشاہی ہے۔ قرآنِ مجید نے اِسے ''جنت'' سے موسوم کیا ہے۔ انسان اِس جنت کو پانے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے اُسے ہدایت کی ہے کہ وہ زندگی بھر اِسے پانے کی جد و جہد میں سر گرم رہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ. (آل عمران 3: 133)

''اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف بڑھ جانے کے لیے دوڑو، جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔''

جنت الفردوس کے اِس نصب العین کو پانے کے لیے اللہ کا مقرر کردہ طریقہ تزکیۂ نفس ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ بہشتِ بریں کے دروازے اُنھی لوگوں کے لیے کھلیں گے، جو اپنے ظاہر و باطن کو ہر لحاظ سے پاکیزہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ

''جو مومن ہو کر اُس کے حضور آئیں

الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى. جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى.

(طٰہٰ 20: 75-76)

گے، جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں، جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔ ہمیشہ رہنے والے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں۔“

یہی تزکیۂ نفس دین کا مقصد ہے۔ گویا دین کی صورت میں ایمان و عمل کی تمام ہدایات نفس کی پاکیزگی کے لیے دی گئی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اللہ کے پیغمبر انسانوں کو اُس طریقے کی تعلیم دیتے ہیں، جس کو اختیار کر کے وہ اپنے نفوس کو پاکیزہ بنا سکتے ہیں۔ استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

”اِس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں ”تزکیہ“ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے اُس کے فکر و عمل کو صحیح سمت میں نشوونما دی جائے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں اور ’رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً‘ کی بادشاہی ہے اور فوز و فلاح کے اِس مقام تک پہنچنے کی ضمانت اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اِس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى.

(الاعلیٰ 87: 14-17)

”البتہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اِس کے لیے اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (لوگو، تم کوئی حجت نہیں پاتے)، بلکہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دراں حالیکہ آخرت اُس سے بہتر بھی ہے اور پایدار بھی۔“

لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اِسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے اور سارا دین اِسی مقصود کو پانے اور اِسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

”اُسی نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے، جو اُس کی آیتیں

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (الجمعہ 62:2)

اُنھیں سناتا اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اِس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" (میزان 80)

اِس سے واضح ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو دین پیش کیا ہے، وہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت ہے۔ چنانچہ اُس کا وظیفہ یہ ہے کہ لوگوں کو پاکیزگی اختیار کرنے کے طریقوں سے آگاہ کیا جائے۔

اِس مقصد کے لیے دین نے متعدد اور متنوع احکام دیے ہیں۔ اِنھی کو مجموعی طور پر 'شریعت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِن احکام کا استقصا کیا جائے تو درجِ ذیل چار نوعیتیں متعین ہوتی ہیں:

1۔ عبادات

2۔ تطہیر بدن

3۔ تطہیر اخلاق

4۔ تطہیر خور و نوش

تزکیۂ نفس کا پورا عمل اِنھی چار اجزا میں منحصر ہے۔

عبادات کے احکام کچھ مقرر اعمال و اذکار پر مشتمل ہیں، جنھیں طے شدہ طریقوں کے مطابق اور معین الفاظ کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ فرائض اور نوافل کے طور پر مشروع ہیں۔

تطہیر بدن کے احکام کچھ رسوم و آداب کی صورت میں ہیں، جن کا اہتمام کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

تطہیر اخلاق کے احکام خیر و شر میں امتیاز کی فطری اساس پر مبنی فضائل و رذائل ہیں، جنھیں انسان کی فطرت پانا چاہتی یا جن سے بچنے کا تقاضا کرتی ہے۔

تطہیر خور و نوش کے احکام خبیث و طیب میں تفریق کی فطری اساس پر مبنی کھانے پینے کے ممنوعات و مباحات ہیں۔

قرآنیات

روشنی کی جستجو ہوتی ہے جب ظلمات میں
دیکھ لیتے ہیں کلام اللہ کے آیات میں

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(19)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ ثُمَّ
اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾
وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

(یہ مباحث جہاد و انفاق کے بارے میں تمھارے سوالوں سے پیدا ہوئے تھے۔ ایمان والو، اِن کا حکم تم پر شاق نہ ہونا چاہیے)۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑ کر اُن سے نکل کھڑے ہوئے؟ اِس پر اللہ نے اُن سے فرمایا کہ مردے ہو کر جیو۔ (وہ برسوں اِسی حالت میں رہے)، پھر اللہ نے اُنھیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر لوگوں میں زیادہ ہیں جو (اُس کے) شکر گزار نہیں ہوتے۔ 243

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٤٦﴾

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ
اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي
الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾

(ایمان والو، اِس سے سبق لو) اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔244

کون ہے جو (اِس جنگ کے لیے) اللہ کو قرض دے گا، اچھا قرض کہ اللہ اُس کے لیے اُسے کئی گنا بڑھا دے۔ اور (جو گریز کرے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ ہی ہے جو تنگی بھی کرتا ہے اور فراخی بھی، اور تم کو (ایک دن) اُسی کی طرف لوٹنا بھی ہے۔245

تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب اُنھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ ہم (اُس کے حکم پر) اللہ کی راہ میں جنگ کریں؟ اِس پر نبی نے کہا: ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے اور پھر تم جہاد نہ کرو؟ وہ بولے: ہم کیوں اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں گے، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے دور نکال دیا گیا ہے؟ لیکن (ہوا یہی کہ) جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا تو اُن میں سے تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پھر گئے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف تھا۔246

اور (اُن کے اِس مطالبے پر) اُن کے نبی نے اُنھیں بتایا کہ اللہ نے طالوت کو تمھارے لیے بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ بولے: اُس کی بادشاہی ہم پر کس طرح ہو سکتی ہے، جب کہ ہم اِس بادشاہی کے اُس سے زیادہ حق دار ہیں اور وہ کوئی دولت مند آدمی بھی نہیں ہے؟ نبی نے جواب دیا: اللہ نے اُسی کو تم پر (حکومت کے لیے) منتخب کیا ہے اور اِس مقصد کے لیے اُسے علم اور جسم،

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ
اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ
مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ
هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ
مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾
وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

دونوں میں بڑی کشادگی عطا فرمائی ہے۔ (یہ سلطنت اللہ کی ہے) اور اللہ اپنی یہ سلطنت، (اپنی حکمت کے مطابق)، جس کو چاہے، بخش دیتا ہے۔ (تم معاملات کو اپنی تنگ نظروں سے دیکھتے ہو) اور اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ 247

اور اُن کے نبی نے اُن کے لیے مزید وضاحت کی کہ (اللہ کی طرف سے) اُس کے بادشاہ مقرر کیے جانے کی نشانی یہ ہے کہ (تمھارا) وہ صندوق (تمھارے دشمنوں کے ہاتھ سے نکل کر) تمھارے پاس آ جائے گا جس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے ہمیشہ) بڑی سکینت رہی ہے اور جس میں وہ یادگاریں بھی ہیں جو موسیٰ اور ہارون کی ذریت نے (تمھارے لیے) چھوڑی ہیں۔ اُسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اِس میں، یقیناً ایک بڑی نشانی ہے تمھارے لیے، اگر تم ماننے والے ہو۔ 248

(بنی اسرائیل کی حکومت سنبھالنے کے بعد) پھر جب طالوت فوجیں لے کر نکلے تو اُنھوں نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک ندی کے ذریعے سے تمھیں آزمائے گا۔ اِس کی صورت یہ ہو گی کہ جو اِس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں ہے اور جس نے اِس ندی سے کچھ نہیں چکھا، وہ میرا ساتھی ہے۔ ہاں، مگر اپنے ہاتھ سے ایک چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ لیکن ہوا یہ کہ اُن میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا باقی سب نے اُس ندی کا پانی پی لیا۔ پھر جب طالوت اُس کے پار اترے اور اُن کے وہ ساتھی بھی جو اپنے ایمان پر قائم رہے، (اور فوجیں دیکھیں) تو (جو لوگ آزمایش میں پورے نہیں اترے تھے)، اُنھوں نے کہہ دیا کہ ہم تو آج جالوت اور اُس کے لشکروں

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙۗ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ
وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿٢٥٣﴾

کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اِس پر وہ لوگ جنھیں خیال تھا کہ اُن کو اللہ سے ملنا ہے، بول اُٹھے کہ (حوصلہ کرو، اِس لیے کہ) بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹے گروہ بڑے گروہوں پر غالب آئے ہیں، اور اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ 249

اور (یہی سچے مسلمان تھے کہ) جب جالوت اور اُس کی فوجوں کا سامنا ہوا تو اُنھوں نے دعا کی کہ پروردگار، ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمارے پاؤں جما دے اور اِن منکر لوگوں پر ہمیں غلبہ عطا کر دے۔ 250

چنانچہ (اُن کی دعا قبول ہوئی اور) اللہ کے حکم سے اُنھوں نے اپنے اُن دشمنوں کو شکست دے دی اور جالوت کو داؤد نے قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے بادشاہی دی اور حکمت عطا فرمائی اور اُسے اُس علم میں سے سکھایا جو اللہ چاہتا ہے کہ اپنے اِس طرح کے بندوں کو سکھائے —— اور حقیقت یہ کہ اگر اللہ ایک کو دوسرے سے نہ ہٹاتا تو زمین فساد سے بھر جاتی، لیکن (اُس نے اِسی طرح ہٹایا ہے، اِس لیے کہ) اللہ دنیا والوں پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔ 251

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں، اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ 252

(بنی اسرائیل بھی اِس بات کو جانتے ہیں، لیکن مانتے اِس لیے نہیں کہ) یہ جو رسول ہیں، ہم نے اِن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، (اِس طرح کہ) اِن میں سے کسی سے اللہ خود ہم کلام ہوا اور کسی کے درجے اُس نے (بعض دوسری حیثیتوں سے) بلند کیے اور (آخر میں) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے نہایت واضح نشانیاں دیں اور روح القدس سے اُس کی تائید کی۔ (چنانچہ یہی

چیز اِن رسولوں کے ماننے والوں میں ایک دوسرے کو جھٹلانے کا باعث بن گئی)۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو نہایت واضح دلائل اُن کے سامنے آگئے تھے، اُن کے بعد یہ رسولوں کے بعد والے ایک دوسرے سے نہ لڑتے، لیکن (اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں پر جبر کرے، اِس لیے) اُنھوں نے اختلاف کیا۔ سو اُن میں سے کوئی (اِن رسولوں پر) ایمان لایا اور کسی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ (تم کو نہ ماننے کی وجہ بھی یہی ہے، اے پیغمبر)، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ہرگز آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جو چاہے کرتا ہے۔ 253

[باقی]

اے کہ ترے وجود سے راہِ حیات کا سراغ
اِس شبِ تار میں نہیں تیرے سوا کوئی چراغ

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہو گا، اُن کی صورتیں ایسی روشن ہوں گی، جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ہے، پھر اُن کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے، وہ آسمان کے سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح چمکتے ہوں گے۔ وہ نہ تھوکیں گے، نہ اُن کی ناک سے رطوبت نکلے گی اور نہ بول و براز کی ضرورت لاحق ہو گی۔ اُن کے برتن سونے کے ہوں گے، یہاں تک کہ کنگھے بھی سونے چاندی کے ہوں گے۔ اُن کی انگیٹھیوں میں نہایت پاکیزہ اور خوشبودار عود سلگتا ہو گا اور اُن کا پسینہ مشک کی طرح ہو گا۔ اُن میں سے ہر ایک کی دو، دو بیویاں ہوں گی، آہو چشم گوریوں میں سے، جن کی پنڈلیوں کا گودا اُن کے حُسن کی وجہ سے گوشت کے اوپر ایسا دکھائی دے گا، جیسے سفید پیانے میں سرخ شراب دکھائی دے۔ جنت میں کوئی بھی کنوارا نہ ہو گا۔ اُن کا آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو گا اور نہ بغض و عناد، اُن کے دل بالکل ایک ہوں گے۔ وہ صبح و شام وہاں اللہ کی تسبیح و تہلیل میں مشغول رہیں گے۔ (بخاری، رقم 3024)

— 2 —

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی راہ میں

جہاد کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر، دنیا اور اُس کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ جنت میں تمھارے کسی شخص کی ایک کمان کے برابر یا ایک قدم جتنے فاصلے کی جگہ، دنیا اور اُس کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ جنت کی عورتوں میں سے کوئی عورت اگر روے زمین کی طرف جھانک کر دیکھ لے تو آسمان سے لے کر زمین تک، ہر چیز کو روشن کر دے اور ہر چیز کو خوشبو سے بھر دے۔ اُس کی تو اوڑھنی تک دنیا اور جو کچھ اُس میں ہے، اُس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ (بخاری، رقم 6111)

— 3 —

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی عورت دنیا میں اپنے شوہر کو تکلیف دیتی ہے تو آہو چشم گوریوں میں سے اُس کی بیوی کہتی ہے: اللہ تجھے ہلاک کرے، اِس کو تکلیف نہ دے، یہ تو تیرے پاس مہمان ہے، قریب ہے کہ یہ تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے گا۔ (مسند احمد، رقم 21528)

جاوید احمد غامدی

اضطراری علم

علم کو بدیہی اور نظری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پھر بدیہی اُسے قرار دیا جاتا ہے جو فکر و تدبر کے بغیر آپ سے آپ حاصل ہوتا ہے اور نظری اُسے جس کا فکر و تدبر کے ذریعے سے خود بدیہی سے اکتساب کیا جاتا ہے۔ اِس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدیہی اصل اور اساس کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور باقی ہر چیز اُس کی فرع قرار پاتی ہے۔ فلسفہ کی ابتدا خارجی حقائق سے متعلق بحث و تمحیص سے ہوئی تھی۔ پھر مدارک کی حقیقت موضوع بحث بنی اور بدیہی کو اصل قرار دیا گیا تو اُس کی علامت یہ سمجھی گئی کہ اُس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوتا، مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے اختلاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور ظنون و شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک فریق کا اصرار ہے کہ معلوم صرف محسوس ہے اور وہی اصل ہے۔ تمام افکار و خیالات اُس چیز سے پیدا ہوتے ہیں جسے ہم اپنے حواس کی مدد سے سمجھتے ہیں۔ دماغ (tabula rasa)، یعنی لوح سادہ ہے۔ ہمارے ادراک سے پہلے کوئی چیز اُس پر ثبت نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ علم واردات نفس ہیں اور نفس مدرکہ کے سوا ہم کسی موجود کے وجود کا یقین نہیں رکھتے۔ تیسرے کا دعویٰ ہے کہ اثر محسوس کے سوا کوئی چیز یقینی نہیں ہے اور چوتھے نے اعلان کر رکھا ہے کہ حس اور فکر، دونوں ناقابل اعتماد ہیں، اِس لیے دنیا میں یقین اور قطعیت نام کی کوئی چیز سرے

سے پائی ہی نہیں جاتی۔

اِس کا نتیجہ کیا ہے؟ پہلے فریق نے عقل، روح، اللہ اور معاد کا انکار کر دیا ہے؛ دوسرا اِس عالم محسوس کو نہیں مانتا؛ تیسرا دونوں کا منکر ہے اور علم محض کے سوا کسی چیز کا اثبات نہیں کرتا؛ چوتھے نے علی الاطلاق علم اور یقین کی نفی کر دی ہے، وہ اِن میں سے کسی چیز کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دیکارت (Descartes) نے جب یہ کہا تھا کہ ”میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں“، تو سقراط و فلاطوں کے بعد ایک مرتبہ پھر علم و تفلسف کو اِسی تشکیک سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔[1] دورِ مابعد جدیدیت میں یہی سوفسطائیت زبان کی تحلیل کے ذریعے سے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتی ہے۔ اِس کا کہنا ہے کہ کوئی علامت یا کوئی لفظ (signifier) بھی کسی متعین شے (signified) کے معنی بیان نہیں کرتا، اِس لیے کہ کسی متعین شے کا کوئی حتمی وجود نہیں ہے۔ ہر لفظ کے معنی جملے میں موجود دوسرے الفاظ کے سہارے متعین کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک لفظ کا اضافہ کر دیجیے یا ایک لفظ کم کر دیجیے تو پورے جملے کے معنی تبدیل ہو جائیں گے۔ چنانچہ معنی نہ الفاظ میں ہیں نہ جملوں میں، وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ جملے میں کوئی لفظ بھی پوری طرح معنی کا متحمل نہیں ہوتا، لہٰذا وہ دوسرے لفظ یا الفاظ تک معنی کو ملتوی (defer) کر دیتا ہے۔ اِسی طرح مختلف الفاظ کے سہارے معنی اپنا رخ متعین کرتے ہیں، عبارت کا سیاق اُنھیں برابر بدلتا رہتا ہے، وہ کبھی قطعی اور حتمی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اُن سے وابستہ اقدار بھی بے معنی ہیں، وہ بھی حتمی نہیں ہو سکتیں۔[2] وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر جو لوگ حقیقت کی تلاش میں نکلے تھے، اُن کی روداد سفر یہی

---

[1]۔ ’Cogito ergo sum‘۔ دیکارت کی یہ کوشش بھی فیصلہ کن نہیں ہو سکی، اِس لیے کہ اِس میں بھی فطرت انسانی کے اندر بدیہیات کی اصل اور اساس کو بنائے استدلال نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ ژاک دریدا (Jaques Derrida) سب سے پہلے وجود کی مابعد الطبیعیاتی حیثیت پر قائم اِسی روایت کو ہدف تنقید بناتا اور اِس بات پر اصرار کرتا ہے کہ خود ’میرا وجود‘ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اِس لیے کہ اُس کے بھی کوئی قطعی معنی نہیں ہیں۔

[2]۔ اِس نقطۂ نظر کے حاملین اِس بات پر غور نہیں کرتے کہ اُن کا یہ استدلال بجائے خود نظر و استدلال کی صحت پر اُن کے یقین کا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یقین کا ابطال بھی اُس سے بالاتر کسی دوسرے یقین

ہے۔ اقبال نے غلط نہیں کہا تھا:

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

قرآن اِس کے برخلاف اپنے استدلال کی بنیاد اُس فطری علم پر رکھتا ہے جو نفس انسانی میں الہام کر دیا گیا ہے۔ انسان کے تمام علم و عمل اور فکر و استدلال کی بنیاد در حقیقت یہی علم ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑتی ہے، وہ بدیہی ہے، لہٰذا اِسی کو اصل مان کر انسان اپنی جستجو شروع کرتا ہے۔ اُسے توجہ نہیں ہوتی کہ یہ حقیقت میں اُس کا فطری علم ہے جو اُسے بدیہیات تک پہنچاتا اور ہانکتا ہوا نظریات تک لے جاتا ہے۔ یہ علم نہ ہوتا تو بداہت، نظر، استدلال، اِن میں سے کوئی چیز بھی وجود پذیر نہیں ہو سکتی تھی، اِس لیے کہ خارج سے جو چیز آتی ہے، وہ صرف موضوعات ہیں۔ اُن کا حکم خارج سے نہیں آتا، وہ نفس کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ وہی یہ حکم لگاتا اور بارہا موضوعات کو نئے موضوعات میں تبدیل کر دیتا ہے تاکہ اُن پر نیا حکم لگائے۔ ذوق و ادراک اِسی کا ظہور ہے جس میں سے پہلا عمل اور دوسرا علم کا مصدر ہے۔ ذات و صفات، حامل و محمول، فعل و انفعال، حسن و قبح، مدرک اور غیر مدرک اور ذات اور اُس کے عوارض میں فرق و امتیاز کا منبع بھی یہی ہے۔ حواس کے ذریعے سے جو اثرات نفس انسانی تک پہنچتے ہیں، اُن سے موثرات پر استدلال اِسی کا وظیفہ ہے جس سے وجود خارجی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ انسان جب تک انسان ہے، اِس کے فیصلوں کا انکار نہیں کر سکتا۔ نفس انسانی پر اِس کی حکومت قائم ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم و انقیاد کوئی اختیاری چیز نہیں ہے، وہ مجبور ہے کہ اِس علم کے فیصلوں کو اُسی طرح تسلیم کرے، جس طرح وہ اپنی جبلتوں کے تقاضے تسلیم کرتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ انسان ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے تو اِس کا کیوں نہیں کر سکتا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ زبان سے یقیناً کر سکتا

کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسان کا اضطرار ہے۔ چنانچہ ابطال کی ہر کوشش کا نتیجہ احقاق ہوتا ہے، لیکن انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ شدت جذبات میں گریز کر کے گزر جاتا ہے۔ شخصی آزادی اور انفرادیت جس کے لیے یہ حضرات مرے جاتے ہیں، وہ بھی ایک قدر ہے اور تمام اقدار کی نفی پر اصرار سے بھی اِس کے سوا کچھ مقصود نہیں کہ اُس سے پھر ایک قدر کا اثبات کیا جائے۔ گویا وہی صورت حال ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

ہے، مگر جس وقت کرتا ہے، عین اُسی وقت اُس کا عمل، اُس کے اعضا و جوارح اور اُس کے احوال اُس کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر سلیم الطبع شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صریح مکابرت ہے۔ امام حمید الدین فراہی نے اِسی بنا پر اِسے علم اضطراری سے تعبیر کیا اور بالکل درست فرمایا ہے کہ نفس انسانی میں ایک مہبط الہام ہے، اِسے مرکز کہنا چاہیے۔ اِس سے علم کا وہ دائرہ وجود میں آتا ہے جسے ہم فطری کہیں گے۔ اِس کے بعد بدیہی اور نظری ہے۔ چنانچہ علم کی تقسیم محض بدیہی اور نظری میں نہیں، بلکہ جذری، فطری، بدیہی اور نظری میں ہونی چاہیے، کیونکہ یہی حقیقت ہے۔

اِس روشنی میں دیکھیے:

قرآن بتاتا ہے کہ خالق کا اقرار مخلوقات کی فطرت ہے۔ وہ اپنے وجود ہی سے تقاضا کرتی ہیں کہ خالق کی محتاج ہیں۔ اُن کے لیے خالق کا اثبات پیش نظر ہو تو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف متنبہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کا انکار نہیں کرتی، بلکہ توجہ دلائی جائے تو اُس کو ماننے کے لیے اِس طرح لپکتی ہے، جس طرح پیاسا پانی کے لیے لپکتا ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ بنی آدم سے جب خدا نے پوچھا تھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں تو سب نے ایک ہی جواب دیا تھا کہ ہاں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ حیات دنیوی میں انسان بعض اوقات انکار کر دیتا ہے۔ یہ محض مکابرت ہے۔ لہٰذا جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت اپنے دائرۂ علم میں ہر انفعال کے لیے فاعل، ہر ارادے کے لیے مرید، ہر صفت کے لیے موصوف، ہر اثر کے لیے موثر اور ہر نظم کے لیے ایک علیم و حکیم ناظم کی تلاش میں سر گرداں ہوتا ہے۔ اُس کا تمام علم اِسی سر گردانی کی سر گذشت ہے۔ یہ عمل کی تکذیب ہے جو اُس کے انکار کی حقیقت بالکل آخری درجے میں واضح کر دیتی ہے۔

یہی معاملہ خیر و شر کے شعور کا ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی نفس انسانی میں الہام کر دیا گیا ہے۔ مگر انسان بعض اوقات انکار کرتا ہے۔ اِسے بھی مکابرت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا، اِس لیے کہ جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت خود اُس کو برائی کا ہدف بنا لیا جائے تو بغیر کسی تردد کے برائی کو برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں، نیکی کی جائے

تو اُس کے لیے عزت و احترام کے جذبات ظاہر کرتا اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے تو اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ اُس کا قانون، عدالتیں اور بین الاقوامی ادارے، سب اِسی حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔

الفاظ کی دلالت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ میزان، فرقان اور فصل نزاعات کے لیے حکم کی حیثیت سے نازل ہوا ہے اور اُس نے اپنی بات اِس قطعیت کے ساتھ پہنچا دی ہے کہ اُس کی بنیاد پر روز قیامت انسان مسؤل ہوں گے اور اُن کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن کا یہ ارشاد اُس فطری یقین پر مبنی ہے جو انسان کو نطق و بیان کی صلاحیت اور اُس کے ذریعے سے ابلاغ کی قطعیت پر ہمیشہ سے رہا ہے۔ ائمۂ فقہ و حدیث ایک مسلمہ قاعدے کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں کہ 'ماثبت بالکتاب قطعی موجب للعلم والعمل'۔ فلسفے کے زیغ و ضلال سے متاثر متکلمین، البتہ نہیں مانتے۔ اُن کا اصرار ہے کہ الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر ظنی ہوتی ہے، اِس لیے قرآن کے الفاظ نہیں، بلکہ عقلی براہین حق و باطل کے لیے کسوٹی ہیں۔[3] یہ بھی، اگر غور کیجیے تو صریح مکابرت ہے، اِس لیے کہ وہ جس وقت یہ کہتے ہیں، عین اُسی وقت اپنا یہ نقطۂ نظر اُنھی الفاظ کے ذریعے سے بیان کر رہے ہوتے ہیں اور اُنھیں ادنیٰ تردد بھی نہیں ہوتا کہ اُن کی بات اُن کے مخاطبین تک پوری قطعیت کے ساتھ نہیں پہنچے گی۔ پھر یہی نہیں، دوسروں کو سنتے اور اُن کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھتے ہوئے بھی اُنھیں اِس طرح کا کوئی تردد کبھی لاحق نہیں ہوتا۔ بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو اُن کا ایک ایک لفظ اِس کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ نفس انسانی پر نفس انسانی کی شہادت ہے جس سے بڑی کوئی شہادت نہیں ہو سکتی: 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ، وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ'۔[4]

ابن قیم لکھتے ہیں:

---

[3]۔ دور مابعد جدیدیت کے مفکرین یقین کی یہ بنیاد بھی انسان سے چھین لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اِس کے بعد بے معنویت اور اتھاہ بے یقینی کے سوا انسان کے پاس کیا باقی رہ جائے گا اور اُس کے آلام اِس کے نتیجے میں کہاں پہنچیں گے، اِس کا کسی کو اندازہ نہیں ہے۔

[4]۔ القیامہ 75: 14-15۔ ''انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

من ادعى أنه لا طريق لنا إلى اليقين بمراد المتكلم، لان العلم بمراده موقوف على العلم بانتفاء عشرة أشياء فهو ملبوس عليه ملبس على الناس؛ فإن هذا لو صح لم يحصل لاحد العلم بكلام المتكلم قط، وبطلت فائدة التخاطب، وانتفت خاصية الإنسان، وصار الناس كالبهائم، بل أسوأ حالاً، ولما علم غرض هذا المصنف من تصنيفه، وهٰذا باطل بضرورة الحس والعقل، وبطلانه من أكثر من ثلاثين وجهًا مذكورة في غير هذا الموضع. (اعلام الموقعين 3/109)

”جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے لیے پورے یقین کے ساتھ متکلم کے منشا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور اُس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اُس کے منشا کا علم اِس چیز پر موقوف ہے کہ پہلے دس چیزوں کی نفی کی جائے،[5] وہ خود بھی الجھاؤ میں ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاؤ میں ڈالنا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو متکلم کے کلام کا علم کبھی حاصل نہ ہوتا، مخاطبت بے معنی ہو جاتی، بلکہ انسان اپنے انسان ہونے کی خاصیت کھو بیٹھتا اور لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اِس مصنف کا مقصد کیا ہے جو یہ اپنی تصنیف سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ عقل اور حس، دونوں کا فیصلہ ہے کہ یہ دعویٰ بالضرور باطل ہے۔ اِس کے ابطال کے تیس سے زیادہ وجوہ ہیں جو دوسری جگہ مذکور ہیں۔“

[2011ء]

---

[5]۔ یعنی اشتراک، مجاز، نقل، اجمال، تخصیص اور معارض عقلی وغیرہ۔ اِس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: شرح المواقف، الجرجانی 2/51۔

وہ دیں، عقل و فطرت پہ جس کی اساس   وہ دیں، روح جس کی خدا کا سپاس
اٹھیں، اِس کو ہر سو ہویدا کریں
زمانے کو پھر اِس کا شیدا کریں

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(20)

”معجزہ“ کا مفہوم اور شق قمر کے واقعہ پر اُس کا اطلاق

’معجزۃ‘ ’اعجاز‘ سے اسم فاعل ہے۔ اِس کے معنی ”عاجز کر دینے والے“ کے ہیں۔ عام مفہوم میں یہ کسی عظیم الشان اور غیر معمولی واقعے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ خلافِ عادت امر ہے، جو انسانی دسترس سے باہر ہو اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں سے صادر ہو۔ ہماری علمی روایت کے مطابق یہ جن مفاہیم اور اطلاقات کو شامل ہے، وہ درجِ ذیل ہیں:

* معجزہ خارقِ عادت ہوتا ہے۔
* اللہ کے اذن پر مبنی ہوتا ہے۔
* نبی کی ذات سے ظاہر ہوتا ہے۔

* دعواے نبوت کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔
* کبھی منکرین کے مطالبے پر نازل کیا جاتا ہے۔
* کبھی کفار کو تحدی (چیلنج) کرنا مقصود ہوتا ہے۔
* کبھی ثباتِ ایمان کے لیے صادر ہوتا ہے۔
* کبھی اہل ایمان کو اللہ کی نصرت سے فیض یاب کرتا ہے۔
* مخاطبین اِس کی مثل پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔
* نتیجتاً یہ نبی کے مخاطبین پر اتمام حجت کا باعث بنتا ہے۔

چند جلیل القدر اہل علم کے اقتباسات نقل ہیں:

علامہ سعد الدین تفتازانی (793ھ) ”شرح عقائد النسفی“ میں لکھتے ہیں:

المعجزة هی امر یظهر بخلاف العادة علیٰ یدی مدعی النبوة عند تحدی المنکرین علیٰ وجه یعجز المنکرین عن الاتیان بمثله. (125)

”معجزہ خلافِ عادت امر ہے۔ یہ نبوت کے مدعی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ منکرین (نبوت) کو اِس (خلافِ عادت امر) کی مثل پیش کرنے کی دعوت دی جائے اور وہ ایسا کرنے سے عاجز ہوں۔“

علی بن محمد الشریف الجرجانی (816ھ) نے اپنی معروف کتاب ”معجم التعریفات“ میں معجزہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

المعجزة أمر خارق للعادة داعیة الی الخیر والسعادة مقرونة بدعوی النبوة قصد به اظهار صدق من ادعی انه رسول من الله. (184)

”معجزہ وہ خلافِ معمول امر ہے جو خیر و برکت کی دعوت اور نبوت کے دعوے کو شامل ہو اور اِس کا مقصد اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرنے والے کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔“

امام جلال الدین السیوطی (849ھ) نے لکھا ہے:

المعجزة: أمر خارق للعادة، مقرون

”معجزہ ایسے خارقِ عادت امر کو کہتے

بالتحدی،سالم عن المعارضہ. (الاتقان فی علوم القرآن 2/311)

ہیں، جس کے ساتھ تحدی (چیلنج) بھی شامل ہو اور اُس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے۔“

محمد علی تھانوی (1158ھ) کی تالیف ”کشاف اصطلاحات الفنون“ میں ہے:

المعجزة: هی فی الشرع أمر خارق للعادة یظهر علیٰ ید مدعی النبوة موافقًا لدعواه.(1575)

”معجزہ: شریعت میں اِس سے مراد وہ خلافِ معمول امر ہے، جو نبوت کے مدعی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا اور اُس کے دعوے کی تائید کرتا ہے۔“

امام شاہ ولی اللہ نے انبیا کے معجزات کی نوعیت اور ضرورت کو طبیب اور دوا کی مثال سے واضح کیا ہے۔ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھتے ہیں:

مثله فی ذلك كمثل سید مرض عبیده، فأمر بعض خواصه: أن یكلفهم شرب دواء أشاؤا أم أبوا، فلو أنه أكرههم علی ذلك كان حقًا، ولكن تمام اللطف یقتضی أن یعلمهم أولاً أنهم مرضی، و أن الدواء نافع، وان یعمل اموراً خارقةً تطمئن نفوسهم بها علی انه صادق فیما قال، و أن یشوب الدواء بحلو فحینئذ یفعلون ما یؤمرون به علی بصیرة منه، وبرغبة فیه؛ فلیست المعجزات ولا استجابة الدعوات ونحو ذلك الا أمورًا خارجةً عن أصل النبوة، لازمةً لها فی الاكثر.(2/64)

”(نبوت کے) اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مثال اُس آقا جیسی ہے، جس کے غلام بیمار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے خاص کارکنان میں سے کسی کارکن کو حکم دیا ہے کہ وہ اُنھیں دوا پینے کا مکلف بنائے، اِس کے باوجود کہ وہ پینا چاہیں یا اُس کا انکار کریں۔ لہٰذا اگر وہ اِس معاملے میں اُن پر سختی کرے تو وہ حق بجانب ہو گا۔ تاہم، کامل مہربانی کا تقاضا ہے کہ (سختی سے) پہلے وہ اُنھیں سمجھائے کہ وہ بیمار ہیں اور یہ دوا اُن کے لیے مفید ہے۔ مزید یہ کہ وہ کچھ خارقِ عادت امور کو ظاہر کرے، جو اُنھیں اِس پر مطمئن کر دیں کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے۔ یعنی دوا میں شیرینی ملا دے۔ اِس کے نتیجے میں

غلام پوری بصیرت اور رغبت کے ساتھ
وہ کام کریں گے، جن کا اُنھیں حکم دیا گیا
ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ معجزات کا ظہور،
دعاؤں کی قبولیت اور اِس طرح کے دیگر
امور نبوت کی حقیقت سے خارج ہیں،
البتہ اکثر حالات میں نبوت کے اسباب و
لوازم میں شامل ہوتے ہیں۔“

شاہ عبد الحق محدث دہلوی بیان کرتے ہیں:

”معجزہ خرقِ عادت کو کہتے ہیں، جو مدعی رسالت و نبوت کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے مقصود تحدی ہے۔ تحدی کے معنی کسی کام میں برابری کرنا اور دشمن کو عاجز کر کے غلبہ حاصل کرنا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ معجزہ میں تحدی شرط نہیں ہے۔“(مدارج النبوہ 1/ 229)

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

”جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں... میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے۔ اور اُس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا، جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اِس کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اِس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اُس کے دعویٰ کی تصدیق ہے۔ در حقیقت معجزہ نبی کے دعویٰ کی عملی تصدیق ہوتی ہے۔“(اعجاز القرآن 31)

معجزہ کے معنی و مفہوم کی اِس تفصیل کے بعد اب یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ عربی زبان ہی کا لفظ ہے اور اِس کے بعض اسالیب کلام الٰہی میں مذکور بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک درجِ بالا اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو اِس مفہوم میں یہ یا اِس کا کوئی اشتقاق کتاب الٰہی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

یہی معاملہ کتب احادیث کا بھی ہے۔ اِن میں بھی یہ لفظ اختیار نہیں کیا گیا۔ تاہم، محدثین نے ابواب کے عنوانات کے لیے اِس لفظ کو اختیار کیا ہے۔

اِسی بنا پر بعض اہل علم کا موقف ہے کہ انبیا کے خوارق کے لیے معجزہ کے لفظ کو استعمال کرنے

سے احتراز کرنا چاہیے۔ سید سلیمان ندوی ''سیرت النبی'' میں ''اِن واقعات کا اصطلاحی نام'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''حضرات انبیاے کرام علیہم السلام سے یہ جو مافوق العادت کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں، اِن کے لیے عام طور پر معجزہ کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اِس لیے کہ قرآنِ مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے، بلکہ اِس کی جگہ آیت (نشانی) اور برہان (دلیل) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم محدثین نے اِن کی جگہ دلائل اور علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر ''معجزہ'' کے ساتھ کچھ خاص لوازم ذہنی پیدا ہو گئے ہیں، جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً: اِس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، جس کا صدور خاص اُس کے اعضا و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اِس لفظ کے سبب سے اِس کا معجزہ ہونا گویا اِس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیالات غلط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اُن کا ایک بڑا حصہ خود لفظِ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے، جس میں نبوت کے تمام خواص، کیفیات، مشاہدات اور اعمالِ خارقۂ عادت و غیر خارقۂ عادت، سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں... لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے، اِس لیے اِس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔''(3/ 21-22)

اِس مفہوم کے لیے کتاب اللہ میں 'آیۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی نشانی کے ہیں۔ تاہم، وہاں اِس سے مراد صرف انبیا کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی نشانیاں ہی نہیں ہیں، اِس کے ساتھ وہ نشانیاں بھی اِس کے مصداقات میں داخل ہیں، جو انفس و آفاق میں روزمرہ ظاہر ہوتی ہیں اور وہ خلافِ معمول نشانیاں بھی داخل ہیں، جنھیں اللہ براہِ راست ظاہر کرتے ہیں۔ مزید برآں، قرآنِ مجید کے فقروں کے لیے بھی یہی لفظ 'آیت' استعمال ہوتا ہے۔[1]

---

[1]۔ مزید تفصیل کے لیے اِسی تصنیف میں باب اول کا ملاحظہ کیجیے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا شق قمر کے واقعے پر لفظ 'معجزہ' کا اطلاق درست ہے؟ درجِ بالا تعریفات کی روشنی میں اِس کا جواب نفی میں ہو گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن کے مطابق معجزہ وہ خارقِ عادت واقعہ ہے، جو اللہ کے حکم سے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ شق قمر، بلا شبہ خارقِ عادت واقعہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے ظاہر ہوا ہے، مگر قرآن وحدیث سے واضح ہے کہ اِس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ اللہ چاہتا تو اِس کے لیے اپنے پیغمبر کا توسط اختیار کر لیتا، جیسا کہ قرآن وحدیث میں مذکور متعدد دیگر معجزات میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر اللہ نے اپنی حکمت کے تحت ایسا نہیں کیا تو ہمیں اِسے معجزے کے بجائے 'آیتِ الٰہی' سے تعبیر کرنا چاہیے۔ جیسے مثال کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا تو بلا شبہ، اُن کا معجزہ کہلائے گا، مگر اُن کے بن باپ کے پیدا ہونے کو اُن کا معجزہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ اللہ کی آیت قرار دیا جائے گا۔

[باقی]

وہ صحبت نشینانِ ختم الرسل وہ تیرہ شبوں میں دلیلِ سبل
وہ حق کی، صداقت کی تصویر تھے
وہ انساں کے خوابوں کی تعبیر تھے

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

اہل بیت کرام کی تعظیم و توقیر

(6)

(3)

عَنِ ابْنِ أَبِي نَجِيحٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ: ”الَّذِی يُحَافِظُ عَلَى أَزْوَاجِی الصَّادِقُ الْبَارُّ“، فَكَانَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ يُسَافِرُ بِهِنَّ، وَيُنْزِلُهُنَّ الشِّعبَ الَّذِی لَيْسَ لَهُ مَنْفَذٌ، وَيَجْعَلُ عَلَى هَوَادِجِهِنَّ الطَّيَالِسَةَ.

(الطبقات الکبریٰ ابن سعد، رقم 8917)

”ابن ابی نجیح نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میری ازواج کی دیکھ بھال کرے گا، وہی سچا اور وفادار ہو گا۔ چنانچہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آپ کی ازواج کو (حج کے) سفر پر لے کر جاتے تھے اور راستے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست ایسی گھاٹی میں کرتے تھے، جس میں دوسری جانب گزرنے کا راستہ نہ ہو اور ازواج کے محمل پر سبز رنگ کی چادریں ڈال کر رکھتے تھے۔“

لغوی تشریح

ھَوَادِج: 'ھودج' کی جمع ہے، یعنی محمل یا پالکی، جس میں خواتین سوار ہوں۔

الطَّیَالِسَۃَ: 'طیلسان' کی جمع ہے، یعنی سبز رنگ کی چادریں۔

شرح و وضاحت

حجاب کا یہ خصوصی اہتمام سورۂ احزاب کی اس ہدایت کی پیروی میں تھا، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج پر حجاب میں رہنے کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِذا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَراءِ حِجابٍ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ. (الاحزاب 53:33)

”اور جب تم پیغمبر کی ازواج سے کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو پردے کے پیچھے رہتے ہوئے طلب کرو۔ یہ تمھارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔“

اس ہدایت کی پیروی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی ازواج کو سفر میں ہم راہ لے کر جاتے تو ان کے لیے حجاب کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے خیبر سے واپسی کے سفر میں سیدہ صفیہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا ذکر یوں کیا ہے:

قَالُوا: إِنْ حَجَبَهَا فَهِيَ إِحْدَى أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ، فَإِنْ لَمْ يَحْجُبْهَا فَهِيَ مِمَّا مَلَكَتْ يَمِينُهُ. فَلَمَّا ارْتَحَلَ وَطَّأَ لَهَا خَلْفَهُ، وَمَدَّ الْحِجَابَ. (بخاری، رقم 4213)

”مسلمانوں نے کہا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حجاب میں رکھا تو یہ امہات المومنین میں سے ایک ہیں اور اگر حجاب میں نہ رکھا تو پھر وہ آپ کی باندی ہیں۔ جب آپ کوچ کرنے لگے تو آپ نے سیدہ صفیہ کو اپنے پیچھے (اپنی سواری پر) بٹھانے کا بندوبست کیا اور (ان کے محمل پر بھی دیگر ازواج کی طرح) حجاب ڈال دیا۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ازواج کے لیے دوران سفر میں اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ زیر بحث اثر میں اسی تناظر میں بتایا گیا ہے کہ حج کے ایک سفر میں عبد الرحمٰن بن عوف یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ ایسی گھاٹی کا انتخاب کرنے میں جس میں سے دوسری جانب نکلنے کا راستہ نہ ہو، یہی حکمت ملحوظ تھی کہ امہات المومنین گذر گاہ میں ٹھہرنے کے بجاے، جہاں وہ گزرنے والوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں، راستے سے ہٹ کر ایک گوشے میں قیام کریں۔

تخریج اور اختلاف طرق

ابن ابی نجیح کا یہ اثر فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، رقم 1252 میں بھی مروی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو حج کے سفر پر لے جانے اور دوران سفر میں ان کے حجاب کے خصوصی اہتمام کی تفصیل دیگر آثار میں بھی بیان ہوئی ہے۔ مثلاً ابن سعد نے عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

أَرْسَلَنِي عُمَرُ وَعُثْمَانُ بِأَزْوَاجِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ السَّنَةَ الَّتِي تُوُفِّيَ فِيهَا عُمَرُ يُحِجُّهُنَّ، فَكَانَ عُثْمَانُ يَسِيرُ أَمَامَهُنَّ، فَلَا يَتْرُكُ أَحَدًا يَدْنُو مِنْهُنَّ وَلَا يَرَاهُنَّ إِلَّا مِنْ مُدِّ الْبَصَرِ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ خَلْفَهُنَّ يَفْعَلُ مِثْلَ ذَلِكَ، وَهُنَّ فِي الْهَوَادِجِ، وَكَانَا يَنْزِلَانِ بِهِنَّ فِي الشِّعَابِ، فَيُقِيلَانِهِنَّ فِي الشِّعَبِ، وَيَنْزِلَانِ فِي فَيْءِ الشِّعَبِ، وَلَا يَتْرُكَانِ أَحَدًا يَمُرُّ عَلَيْهِنَّ. (الطبقات الکبریٰ، رقم 8912)

”جس سال عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی، انھوں نے اور عثمان بن عفان نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو حج کرانے کے لیے ان کے ہم راہ بھیجا۔ (راوی بتاتے ہیں کہ اس سفر میں) حضرت عثمان ازواج مطہرات کے آگے چلتے تھے، اور کسی کو ان کے قریب آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اور کوئی ان کو حد نگاہ سے زیادہ قریب ہو کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عبد الرحمٰن بن عوف ان کے پیچھے چلتے تھے اور وہ بھی اسی طرح کرتے تھے۔ ازواج مطہرات پالکیوں میں ہوتی تھیں۔ عثمان اور عبد الرحمٰن بن عوف

(راستے میں) ان کو پڑاؤ کراتے تو ازواج کو گھاٹیوں میں ٹھہراتے اور خود گھاٹی کے سایے میں، (یعنی بیرونی جانب) رکتے تھے اور کسی کو ازواج کے قریب سے گزرنے نہیں دیتے تھے۔“

ام معبد نے بھی اپنی روایت میں یہی کیفیت نقل کی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

رَأَيْتُ عُثْمَانَ وَعَبْدَ الرَّحْمَنِ فِي خِلَافَةِ عُمَرَ حَجّا بِنِسَاءِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ، فَرَأَيْتُ عَلَى هَوَادِجِهِنَّ الطَّيَالِسَةَ الْخُضْرَ، وَهُنَّ حِجْرَةٌ مِنَ النَّاسِ، يَسِيرُ أَمَامَهُنَّ ابْنُ عَفَّانَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، يَصِيحُ إِذَا دَنَا مِنْهُنَّ أَحَدٌ: إِلَيْكَ إِلَيْكَ، وَابْنُ عَوْفٍ مِنْ وَرَائِهِنَّ يَفْعَلُ مِثْلَ ذَلِكَ، فَنَزَلْنَ بِقُدَيْدٍ قَرِيبًا مِنْ مَنْزِلِي، اعْتَزَلْنَ النَّاسَ وَقَدْ سَتَرُوا عَلَيْهِنَّ الشَّجَرَ مِنْ كُلِّ نَاحِيَةٍ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهِنَّ وَهُنَّ ثَمَانٍ جَمِيعًا.

(الطبقات الکبریٰ، رقم 8914)

”میں نے سیدنا عمر کی خلافت کے دور میں عثمان بن عفان اور عبد الرحمٰن بن عوف کو دیکھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو حج کے لیے لے کر جا رہے تھے۔ میں نے ان کی پالکیوں پر سبز رنگ کی چادریں دیکھیں، اور وہ لوگوں سے الگ تھلگ سفر کر رہی تھیں۔ عثمان بن عفّان اپنی سواری پر ان کے آگے آگے چل رہے تھے اور جب کوئی قریب آتا تو وہ پکارتے تھے: دور رہو، دور رہو۔ عبد الرحمٰن بن عوف ان کے پیچھے چل رہے تھے اور وہ بھی ایسا ہی کر رہے تھے۔ رسول اللہ کی ازواج نے مقام قدید میں میرے گھر کے قریب پڑاؤ کیا۔ وہ لوگوں سے بالکل ہٹ کر ٹھہریں، اور انھوں نے ہر طرف سے ان پر درختوں (کی شاخوں) سے پردہ کر دیا۔ میں ان کے پاس گئی اور وہ آٹھ کی آٹھ وہاں موجود تھیں۔“

(4)

عَن عَطَاءٍ، قَالَ: حَضَرْنَا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ جِنَازَةَ مَيْمُونَةَ بِسَرِفَ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: هَذِهِ زَوْجَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ، فَإِذَا رَفَعْتُمْ نَعْشَهَا فَلاَ تُزَعْزِعُوهَا، وَلاَ تُزَلْزِلُوهَا، وَارْفُقُوا. فَإِنَّهُ كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ تِسْعٌ، كَانَ يَقْسِمُ لِثَمَانٍ وَلاَ يَقْسِمُ لِوَاحِدَةٍ. (بخاری، رقم 4797)

”عطاء کا بیان ہے کہ ہم عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ مقام سرف میں ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے جنازے میں حاضر ہوئے۔ ابن عباس نے کہا: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں، تو جب تم ان کی چارپائی کو اٹھاؤ تو زور سے جھٹکے نہ دو اور آہستگی سے لے کر چلو۔ (پھر بتایا کہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں (بہ یک وقت) نو بیویاں تھیں، جن میں سے آٹھ کے پاس آپ باری باری دن گزارتے تھے اور ایک کے پاس نہیں گزارتے تھے۔“

لغوی تشریح

نَعْشَ: جنازے کی چارپائی۔

لاَ تُزَعْزِعُوهَا: ’زعزع‘ کا مطلب ہوتا ہے: زور سے جھٹکے دینا۔

شرح ووضاحت

سیدہ میمونہ کا انتقال 51ھ میں مکہ کے قریب مقام سرف میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین کی گئی۔ سیدہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اور رخصتی بھی 7ھ میں عمرے کے لیے مکہ مکرمہ جاتے اور واپس آتے ہوئے اسی مقام پر ہوئی تھی۔ اس اثر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی خالہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی میت کی چارپائی اٹھانے والوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مکرمہ کے ادب اور احترام کو ملحوظ رکھیں اور زور سے جھٹکے دینے کے بجائے چارپائی کو وقار اور سکون کے ساتھ اٹھا کر چلیں۔ مراد یہ ہے کہ امہات المومنین کی توقیر و احترام جیسے ان کی زندگی میں لازم تھا، اسی طرح وفات کے بعد ان کی میت کو اٹھانے اور تدفین

میں بھی ملحوظ رہنا چاہیے۔

ابن عباس نے مزید بتایا ہے کہ سیدہ میمونہ ان نو ازواج میں شامل تھیں جو بہ یک وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔ ان میں سے آٹھ ازواج، یعنی سیدہ عائشہ، سیدہ حفصہ، سیدہ زینب، سیدہ ام سلمہ، سیدہ ام حبیبہ، سیدہ میمونہ، سیدہ صفیہ اور سیدہ جویریہ کی باریاں مقرر تھیں اور آپ باری باری ان کے پاس ایک ایک دن گزارتے تھے، جب کہ سیدہ سودہ بنت زمعہ نے کبر سنی کے باعث اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ کو دے دیا تھا اور آپ ان کے پاس دن نہیں گزارتے تھے۔ اثر کے بعض طرق میں عطاء بن ابی رباح نے اس زوجہ کا نام جن کے لیے باری مقرر نہیں تھی، سیدہ صفیہ بتایا ہے، جو درست نہیں۔ امام بیہقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ یہ دراصل سیدہ سودہ تھیں۔[1]

تخریج اور اختلاف طرق

ابن عباس کا یہ اثر درج ذیل مصادر میں بھی مروی ہے:

مسلم، رقم 2738۔ نسائی، رقم 3181۔ السنن الکبریٰ للنسائی، رقم 5159، 8653۔ مسند احمد بن حنبل، رقم 1989۔ المستدرک علی الصحیحین، رقم 6899۔ المعجم الکبیر للطبرانی، رقم 11220۔ مصنف عبد الرزاق، رقم 6051۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم 12566۔ مستخرج ابی عوانۃ، رقم 3620۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، رقم 8717۔ اخبار مکۃ للفاکہی، رقم 2766۔ مشکل الآثار للطحاوی، رقم 1955۔

[باقی]

---

[1]۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم 12566۔

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

ڈاکٹر عمار خان ناصر

مذہبی شناختیں، تاریخی صورت حال اور درپیش چیلنجز

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

''ادارہ تعلیم و تحقیق'' (ORE) کے زیر اہتمام ایک ورکشاپ میں مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے اساتذہ کی ایک نشست میں ''مذہبی شناختیں، تاریخی صورت حال اور درپیش چیلنجز'' کے عنوان پر ڈیڑھ دو گھنٹے گفتگو کا موقع ملا۔ کئی اہم سوالات بھی سامنے آئے، جن پر معروضات پیش کی گئیں۔ چند بنیادی نکات جن پر گفتگو کی گئی، ملخصاً حسب ذیل ہیں:

1۔ برصغیر میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت بنیادی طور پر سنی حنفی صوفی اسلام کی شناخت رہی ہے، تاہم تاریخی عوامل سے یہاں تدریجاً سنی اسلام کے مقابلے میں شیعہ اسلام، حنفی اسلام کے تقابل میں اہل حدیث اسلام، اور صوفی اسلام کے مقابلے میں سلفی اسلام کی شناختیں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ قریبی زمانے میں اس تقسیم میں روایتی اسلام بہ مقابلہ تجدد پسند اسلام کا اور دعوتی اسلام بہ مقابلہ سیاسی اسلام کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ سوشل میڈیا کی دستیابی کے بعد یہ تفریق اب گروہی شناختوں سے آگے بڑھ کر شخصی فرقوں کی شکل میں بھی سامنے آ رہی ہے اور مختلف اقسام کے

داعیان اسلام اپنے اپنے شخصی حلقے تشکیل دے رہے ہیں۔

2۔ اس صورت حال میں کسی قسم کی تخفیف کے امکانات بہ ظاہر مفقود اور اضافے کے امکانات بہت واضح ہیں۔ اس کے دیگر تاریخی اسباب کے علاوہ ایک بہت بنیادی سبب جدید سیاسی طاقت کی خاص ساخت ہے، جو نہ صرف اپنے وجود اور بقا کے لیے کسی مذہبی شناخت یا مذہبی قانون کی محتاج نہیں، بلکہ اپنے بنیادی تصور کے اعتبار سے مذہبی شناختوں پر کنٹرول قائم کرنے کا اختیار حاصل ہونے کی مدعی بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں دارالاسلام اپنی بنت میں ایک دینی سیاسی تصور تھا، جس میں حکمران طبقے کو قانونی جواز حاصل کرنے اور نظم سلطنت چلانے کے لیے کسی نہ کسی دینی تعبیر اور فقہی ضابطے کی احتیاج ہوتی تھی۔ یہ چیز جدید ریاست کو، چاہے وہ کتنی ہی ''اسلامی'' ہو، دار الاسلام کے ماقبل جدید سیاسی تصور سے بالکل مختلف بنا دیتی ہے۔

3۔ دار الاسلام کا دینی سیاسی تصور اس نکتے کو بھی متضمن تھا کہ حکمران منحرف دینی رجحانات کا قلع قمع کرنے اور ان کے شیوع کا سدباب کرنے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی خاص دینی تعبیر اور سیاسی طاقت کے مابین تعلق قائم ہونے کا اثر بسا اوقات مخالف دینی گروہوں کی پرسیکیوشن کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔ جدید ریاست اس کے بالکل برعکس، نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی، بلکہ خود کو ہر قسم کی مذہبی شناختوں کے بنیادی انسانی حقوق اور جمہوری آزادیوں کے تحفظ کا ذمہ دار مانتی ہے۔

4۔ سیاسی طاقت کی اس نئی وضع کو نہ سمجھنے اور ذہنی طور پر قدیم تاریخی صورت حال میں مقید ہونے کی وجہ سے مذہبی شناختوں نے اپنی تقویت اور توسیع کے لیے، باہمی اختلافات کے دائرے میں تکفیر و تضلیل کی اور سیاسی طاقت کے روبہ رو مذہبی سیاست کی جو حکمت عملی اختیار کی ہے، اس کے تین براہ راست اثرات مرتب ہوئے ہیں اور ان کا مرتب ہونا ناگزیر ہے۔ یہ تین اثرات درجِ ذیل ہیں:

i۔ سیکولرائزیشن کے لیے جواز۔

ii۔ مذہبی اظہارات پر ریاستی نگرانی اور تحدیدات کے قیام کا جواز۔

ii۔ مذہب سے لاتعلقی، تنفر اور الحاد۔

5۔ جدید ریاست چونکہ فی نفسہٖ اپنے قیام یا جواز کے لیے کسی قسم کی مذہبی بنیاد کی دست نگر

نہیں، اس لیے مذہبی سیاست کے راستے سے یہ تعلق مصنوعی طور پر اور زبردستی قائم کرنے کا راستہ ایک خاص حد تک ہی آگے جا سکا ہے۔ بنیادی طور پر اس ضمن میں ہونے والی پیش رفت علامتی سطح تک اور ظواہر کی حد تک محدود ہے اور ریاستی نظام پر اس کے کوئی عملی اثرات مرتب نہیں ہو سکے۔ البتہ اس کھینچا تانی میں ایک طرف مذہب اور مذہبی قیادت کی اخلاقی ساکھ بری طرح مجروح ہوئی ہے، اور دوسری طرف اہل حل وعقد کے طبقات میں جوابی اقدامات کی ضرورت کا احساس بھی بیدار ہو رہا ہے، جس کے نتائج بھلے کچھ عرصے کے بعد ظاہر ہوں، لیکن اس کے واضح آثار اس وقت بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

6۔ سماجی سطح پر مذہبی شناختوں کی باہمی کشمکش نے جو بدنما صورت اختیار کی، اس میں ریاست، ظاہر ہے کہ کسی خاص شناخت کی پشت پناہ تو بن نہیں سکتی تھی، لیکن مذہبی منافرت اور تصادم نے ریاست کو یہ موقع ضرور فراہم کیا ہے کہ وہ قیام امن کے لیے مذہبی اظہارات کو کنٹرول کرنے کے ایسے نظم وضع کرے، جو ریاست کی نگرانی میں کام کریں۔ ہر انتظامی سطح پر مختلف قسم کی امن کمیٹیاں، علما بورڈ، فرقہ دارانہ کتابوں پر پابندی، مذہبی ہم آہنگی کے اعلامیے اور پیغام پاکستان جیسی دستاویزات اسی پیش رفت کے مختلف مظاہر ہیں اور یہ مجموعی پیغام دیتے ہیں کہ فرقہ دارانہ شناختوں کو ''اچھا بچہ'' بن کر رہنے کے لیے ریاست کی نگرانی اور محاسبے کی ضرورت ہے۔

7۔ اپنی بقا اور تقویت کی موجودہ حکمت عملی کی وجہ سے مذہبی شناختوں کو سب سے زیادہ جس میدان میں پسپائی اور چیلنج کا سامنا ہے، وہ نئی نسل کو نفس مذہب سے، چہ جائیکہ کسی خاص مذہبی شناخت سے، وابستہ رکھنے کا میدان ہے۔ یہاں بھی مذہبی دانش کی تفہیم وتجزیہ معروضی نہیں، بلکہ غیر حقیقی خواہشات پر مبنی ہے۔ مذہبی طبقے سمجھتے ہیں کہ شناخت کو درپیش خطرات کے جواب میں شناخت کے حصار کو جتنا زیادہ تنگ اور بے لچک رکھیں گے، اتنی ہی شناخت کی حفاظت ممکن ہو گی، جب کہ یہ تجزیہ بالکل غلط اور برعکس نتائج پیدا کرنے کا موجب ہے۔ بھاری بھرکم اور بے لچک مذہبی شناختوں کا جوا اٹھائے رکھنے کا تحمل نئی نسل میں نہیں ہے۔ جدید علم اور جدید دنیا نے مذہب کے بنیادی مسلمات پر اعتقاد رکھنے کو جتنا مشکل بنا دیا ہے، تعبیراتی اضافوں اور بھاری بھرکم شناختوں پر اصرار اس مشکل کو کم نہیں کرتا، بلکہ کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

اس کا پہلا اور زیادہ عام مرحلہ یہی ہوتا ہے کہ جب ہر فرقہ بہتر (72) گم راہ فرقوں کے انجام

کا ڈراوا دے کر خود کو ”واحد نجات یافتہ“ گروہ قرار دینے پر اصرار کرتا ہے تو اس سے تکلیف اور ذمہ داری اور خدائی محاسبے کا جو دینی تصور پیدا ہوتا ہے، اس کو ہضم کرنا ذرا سا بھی اخلاقی شعور رکھنے والے کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اگر اختلافات اور تعبیرات کے ہجوم میں واحد نجات یافتہ تعبیر دین متعین طور پر کسی ایک فرقے کے پاس ہے اور اس کے ساتھ وابستگی نجات کی اولین شرط ہے تو کتنے لوگ ہیں جو سارے کام چھوڑ کر اس تحقیق کے لیے خود کو فارغ کر سکتے ہیں؟ اور اگر تحقیق کے بغیر اپنے موروثی فرقے کے ساتھ جڑا رہنا مطلوب ہے تو اس میں کسی ایک فرقے اور دوسرے فرقے کی تخصیص کیسے ہو سکتی ہے؟

یہ وہ پہاڑ جیسا سوال ہے، جس کا جواب کسی بھی فرقے کے پاس نہیں ہے، لیکن چونکہ کوئی بھی فرقہ اس میں ذرا بھی گنجایش دینے کے لیے آمادہ نہیں، اس لیے انسان کا فطری نفسیاتی ردعمل یہی بنتا ہے کہ وہ اس سوال سے ہی ذہناً لاتعلق ہو جائے۔ یہی لاتعلقی پھر مذہب کی مشہود صورت حال اور مذہبی طبقے کی اخلاقیات سے تنفر میں بدلتی ہے اور اس سے اگلا مرحلہ الحاد کا ہوتا ہے۔ پس الحاد کے اسباب جتنے خارجی ماحول اور جدید دنیا میں ہیں، اتنے ہی فرقہ دارانہ تعبیرات پر اصرار اور مذہبی رویوں میں بھی ہیں اور یہ رویے، مذہبی شناختوں کے تحفظ کے ارادے سے دراصل اس بنیاد (یعنی نفس مذہب سے وابستگی) کو ہی ڈھا دینے کا سبب بن رہے ہیں، جس پر کوئی بھی مذہبی شناخت استوار ہو سکتی ہے۔

هذا ما عندي والله أعلم

گفتگو: محمد حسن الیاس

ترتیب وتدوین: شاہد رضا

فکری گم راہی کے اسباب

(1)

[جناب محمد حسن الیاس صاحب (ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن، غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ) کے بحرین کے دورے 2022ء میں دیے گئے لیکچر سے اخذ واستفادہ پر مبنی]

کسی بھی فکر میں گم راہی کو پرکھنے کے لیے پانچ اسباب ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی دینی افکار و تعبیرات موجود ہیں، اگر کسی فکر میں ان میں سے کوئی ایک پہلو بہ طور اصول پایا جائے تو وہ گم راہی کی فکر ہے۔ اسلام کی علمی روایت میں وجود پذیر ہونے والے دینی رجحانات پر نقد کا تسلسل انھی پانچ اسباب کی بنیاد پر رکھا جائے گا۔ یہ وہ معیارات یا فلٹرز ہیں جن کی بنیاد قرآن مجید یا علم و عقل کے مسلمات میں پائی جاتی ہے۔ ان کو اپنی واقعیت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ فکری گم راہی کے درج ذیل پانچ اسباب ہیں:

1۔ زبان نطق ہے، اُسے منطق بنایا جائے

2۔ تشابہات کے درپے ہونا

3۔ اصل کو فرع اور فرع کو اصل بنا لینا

4۔ اصول وماخذ میں بدعت پیدا کرنا

5۔ علم و عقل اور تاریخی مسلمات کا انکار

1۔ زبان نطق ہے، اُسے منطق بنایا جائے

اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ایک خاص زبان میں ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا۔ زبان محض متفرق الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، جو ہم بولتے، سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ کسی فرد، گروہ یا عہد کی ایجاد نہیں، بلکہ صدیوں کے تعامل، ثقافتی ارتقا اور تواتر کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہمارے اردگرد موجود اشیا کے لیے متعین الفاظ ایک مشترک مفہوم رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے رکھی ہوئی میز کو سب ”میز“ ہی کہیں گے۔ ہم اس حقیقت کو آج نئے سرے سے ایجاد نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ زبان کے تاریخی تسلسل کا نتیجہ ہے۔

اسی اصول کا اطلاق قرآن مجید پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام ایک زندہ اور متعین زبان، یعنی عربی میں نازل کیا، جو ایک معلوم تاریخی تسلسل سے ہم تک منتقل ہوئی اور اپنے مسلمہ نحوی اصول رکھتی ہے۔ لفظ، جملے کا حصہ بن کر اپنے سیاق وسباق سے ایک مفہوم متعین کرتا ہے۔ چنانچہ کلام سے اخذ معانی کا سفر انھی آفاقی قواعد اور متواتر معنی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ اسے اسی زبان کے قواعد واصول کی روشنی میں پڑھا جائے، نہ کہ کسی مجرد منطقی قیاس یا فلسفیانہ نظریے یا پھر الفاظ کی خود ساختہ اصل معنی کی تجرید کے عقلی اطلاقات کی بنیاد پر۔

فکری گم راہی کی پہلی سیڑھی یہی ہے کہ انسان اللہ کی کتاب کو زبان کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی خارجی منطق یا عقلی موشگافی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ جب اللہ کا کلام ایک معلوم اور زندہ زبان میں ہے تو اسے سمجھنے کا درست طریقہ بھی وہی ہو گا، جو اس زبان کے ماہرین، تاریخی تعامل اور اہل علم نے متعین کیا ہے۔ زبان کو نظر انداز کر کے محض منطق کی بنیاد پر قرآن کی تعبیر کرنے کا مطلب، درحقیقت اس کے اصل مفہوم کو مسخ کرنا اور اپنی ذاتی رائے کو وحی پر مسلط کرنا ہے، جو فکری انحراف اور گم راہی کا سبب بنتا ہے۔

لہٰذا، قرآن مجید کو سمجھنے کا پہلا اصول یہی ہے کہ اسے اُس زبان کے قواعد، اس کے عرف اور اس کے اسالیب کی روشنی میں پڑھا جائے، جس میں وہ نازل ہوا، نہ کہ کسی مجرد عقلی استدلال کی روشنی میں، جو خود بدلتے نظریات اور شخصی آرا کا محتاج ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد

فرمایاہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَالۡبَغۡيَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَاَنۡ تُشۡرِكُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ.(الاعراف 7:33)

”میرے پروردگار نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ، جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔“

یہاں ’اِنَّمَا‘ کا لفظ حصر (restriction) پیدا کرتا ہے، یعنی اللہ نے صرف ان چند چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ’اِنَّمَا‘ کا مفہوم حصر پیدا نہیں کرتا تو سوال یہ ہو گا کہ وہ کس بنیاد پر یہ کہہ رہا ہے؟ اُس کی بات کی دلیل خود زبان کے نظائر کی روشنی میں کیا ہے؟ زبان کے قواعد گھر بیٹھ کر بہ زعم خویش اختراع نہیں کیے جاسکتے۔ زبان کا ایک تاریخی تسلسل ہوتا ہے اور اس کے الفاظ متعین معانی رکھتے ہیں، جو تواتر سے نکلے ہوتے ہیں۔

یہ مسئلہ صرف قرآن کی تفہیم تک محدود نہیں، بلکہ ہر علمی متن کی تعبیر اسی اصول پر کی جاتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) کی کوئی کتاب رکھی جائے تو سب سے پہلے یہی پوچھا جائے گا کہ یہ کس زبان میں ہے؟ اس زبان میں کسی لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی لفظ کا مطلب گھڑ لے تو وہ علمی بددیانتی ہو گی۔

چنانچہ ہمارے ہاں جو بڑی گم راہیاں پیدا ہوئیں، اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ ہم نے زبان کا دامن چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں فکری آرا کے وہ شاہکار خزائن دریافت ہوئے جن کی دریافت سے امت کی علمی تاریخ ہمیشہ محروم رہی۔ مثلاً آخری پارے کی سورتیں پڑھ کر پہاڑ اڑنے والی قیامت کی نشانی[1] کے بارے میں کہا کہ اس سے مراد تو صنعتی انقلاب (industrial revolution) ہے

[1]۔ القارعہ 101:5۔ ’وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ‘ (اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے)۔

اور جنوں سے مراد تو صحرا کی مخلوق ہے۔ یہ تمام نظریات کو زبان تسلیم نہیں کرتی ہے۔ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا کہ:

نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ. (الشعراء26:193-195)

”اِس کو روح الامین لے کر اترا ہے۔ تمھارے دل پر، اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبردار کرنے والے بنو۔ نہایت صاف عربی زبان میں۔“

قرآن مجید نے خود کو ’بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ‘ کہا ہے، یعنی یہ ایک واضح اور بلیغ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مطالب کسی ابہام یا الجھاؤ کا شکار نہیں ہو سکتے۔ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو کائنات کے سب سے بڑے اور اہم ترین سوالات کے جوابات، دین کے بنیادی اصول اور آخری حجت فراہم کرے اور وہ اس قدر غیر واضح ہو کہ کوئی بھی اس کے معانی کو اپنی مرضی کے مطابق بدل سکے۔ یہ بات خود عقل کے خلاف ہے کہ اللہ ایک نبی کو زمین پر بھیجے، فیصلہ کن استدلال پیش کرے اور پھر وہ استدلال اس قدر مبہم ہو کہ ہر شخص اسے اپنے من پسند معنی پہنا سکے۔ کسی بھی زبان میں جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس کے ایک متعین مفہوم ہوتے ہیں اور بولنے والا یہ ہرگز برداشت نہیں کرتا کہ اس کی گفتگو کو من مانی تشریحات میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ اصول صرف قرآن تک محدود نہیں، بلکہ ہر علمی اور قانونی متن پر لاگو ہوتا ہے۔ عدالت میں جج کبھی بھی اپنا فیصلہ شاعری یا مبہم الفاظ میں نہیں لکھتا کہ ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق اس سے نتیجہ اخذ کر لے۔ عدالت میں فیصلے دوٹوک اور واضح ہوتے ہیں، کیونکہ وہاں کسی کی جان اور حقوق کا فیصلہ ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کی کتاب، جو قیامت تک کے لیے انسانیت کے لیے فیصلہ کن حجت ہے، کسی مبہم یا لچک دار مفہوم کی حامل ہو؟

لہٰذا، قرآن کی ایک متعین تاویل ہے، جو اس کی اصل زبان اور سیاق و سباق کے مطابق ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی عالم دین کے نام پر کوئی بات کہتا ہے تو اس سے پہلا سوال یہی ہونا چاہیے

کہ اگر آپ قرآن کی کوئی حقیقت بیان کر رہے ہیں تو بتائیں کہ یہ قرآن میں کہاں بیان ہوئی ہے اور اُس کی زبان کیسے ان تشریحات کو قبول کرتی ہے؟

قرآن کو سمجھنے کے لیے کسی بیرونی منطق، قیاس آرائی یا شخصی آرا کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے اس کی اپنی زبان اور اس کے اپنے اصولوں کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔

2۔ متشابہات کے درپے ہونا

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین ہمیں دیا ہے، وہ دو بنیادی حصوں پر مشتمل ہے: محکمات اور متشابہات۔ محکمات وہ آیات ہیں جو بالکل واضح، دوٹوک اور غیر مبہم ہیں۔ یہ دین کے بنیادی عقائد، شریعت کے احکام اور اخلاقی اصولوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کے معانی، مفہوم و مدعا میں کسی قسم کی پیچیدگی یا ابہام نہیں ہوتا اور یہی آیات دین کی اصل بنیاد ہیں۔ دوسری طرف متشابہات وہ آیات ہیں جن کے معنی متعین ہیں، لیکن وہ ایسی حقیقتوں پر مشتمل ہیں جنھیں ہماری عقل اور حواس مکمل طور پر گرفت میں نہیں لے سکتے اور جن کا حقیقی ادراک صرف آخرت میں ممکن ہو گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ انسان کے علم کا دائرہ متعین اور محدود ہے۔ انسان اپنی فطرت کے ظاہری اور باطنی حاصلات اور عقلی استنباط کے نتائج سے ہی علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔

چنانچہ ہم انسان حقائق سے اپنا تعلق پہلے سے موجود تصورات کی مثالوں کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن اسی ذخیرۂ الفاظ اور تجربات کی مدد سے حقیقت کا ادراک کرتا ہے، جو ہمارے حواس نے ہمیں فراہم کیا ہے، لیکن کائنات میں بعض حقائق ایسے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے اُس طرح نہیں رکھ سکتے، جس طرح وہ حقیقت میں ہیں، بلکہ صرف ہمیں ہمارے علم کی رعایت سے سمجھا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنت اور جہنم کی اصل حقیقت، خدا کا وجود اور اس کی صفات اور عرش و آسمان کی کیفیات وہ چیزیں ہیں، جنھیں ہم اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم خود ان کا مشاہدہ نہ کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کا فہم دینے کے لیے تشبیہ اور مثالوں کا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا جنت کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس میں بہتی نہریں ہوں گی، خوشبو دار باغات ہوں گے، وہاں کی

نعمتیں ایسی ہوں گی جن کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جہنم کے عذاب کو سمجھانے کے لیے آگ، زنجیروں اور ابلتے پانی کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں فرمایا: 'لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ' (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو کسی اور چیز کے ساتھ مکمل طور پر تشبیہ نہیں دی جا سکتی، کیونکہ وہ انسانی تجربے سے ماوراہیں۔

چونکہ متشابہات کی حقیقت کا مکمل علم ہمارے پاس نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ جو لوگ دین میں گم راہی اختیار کرتے ہیں، وہ انھی متشابہات میں الجھتے ہیں اور ان کی من مانی تشریحات، مصداقات اور حقائق متعین کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو 'دلوں میں ٹیڑھ رکھنے والے' کہا ہے، کیونکہ وہ متشابہات کو بنیاد بنا کر دین میں شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، 'راسخون فی العلم' (پختہ علم رکھنے والے) وہ لوگ ہوتے ہیں، جو محکمات کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور دین کو ان واضح اصولوں کی بنیاد پر سمجھتے ہیں، نہ کہ مبہم تشبیہوں اور ظاہری مثالوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

لہٰذا، قرآن کی تفہیم میں سب سے اہم چیز یہی ہے کہ متشابہات کو ان کی حد میں رکھا جائے اور محکمات کو دین کی بنیاد سمجھا جائے۔ جو لوگ دین کے نام پر محض غیر واضح باتوں میں الجھتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق قرآن کی تاویل کرتے ہیں، وہ دراصل فکری گم راہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیں بار بار تلقین کرتا ہے کہ ہم دین کو اس کی اصل بنیاد، یعنی محکمات کی روشنی میں سمجھیں اور متشابہات کے معاملے میں غیر ضروری قیاس آرائیوں سے گریز کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِيْ

”وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے جس میں آیتیں محکم بھی ہیں جو اِس کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور (اِن کے علاوہ) کچھ دوسری متشابہات بھی ہیں۔ سو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں، وہ اِس میں سے ہمیشہ متشابہات کے

الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

(آل عمران 3:7)

درپے ہوتے ہیں، اِس لیے کہ فتنہ پیدا کریں اور اِس لیے کہ اُن کی حقیقت معلوم کریں، درآں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اِس کے برخلاف جنھیں اِس علم میں رسوخ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اِنھیں مانتے ہیں، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کی چیزوں کو وہی سمجھتے ہیں جنھیں اللہ نے عقل عطا فرمائی ہے۔‘‘

جب کوئی مذہبی فکر یا عالم متشابہات کے دائرے میں داخل ہو کر گفتگو کرے تو فوراً یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ آیا یہ علمی طور پر درست ہے یا محض قیاس آرائی پر مبنی ہے۔ متشابہات وہ حقائق ہیں، جن کی حقیقت کا مکمل ادراک انسانی عقل کے لیے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے واضح طور پر بتایا ہے کہ جو لوگ ان کی حقیقت کے پیچھے پڑتے ہیں، ان کے دلوں میں ٹیڑھ اور کجی ہوتی ہے۔ ان کا رویہ علمی جستجو پر مبنی نہیں، بلکہ فکری گم راہی کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا فہم انسانی حواس اور علم کے دائرے سے باہر ہے۔

صوفیانہ روایت میں پیدا ہونے والی اصل خرابی بھی اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ خدا کی ذات، جس کا ادراک انسانی علم اور حواس سے ممکن نہیں، اس کی حقیقت میں غوطہ زن ہو کر تخیل کے گھوڑے دوڑانا اور اس کے بارے میں مختلف تصورات قائم کرنا بنیادی فکری گم راہی ہے۔ یہ رجحان ہمیں مختلف صوفیانہ نظریات میں نظر آتا ہے، جہاں لوگ خدا کے ’’حقیقی مواجہے‘‘ اور ’’قرب کے متبادل راستے‘‘ تلاش کرنے لگتے ہیں، اس کی ذات کے بارے میں کائناتی تجسیم کے تصورات پیش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے خدا کو عرش پر جا کر دیکھا یا اس سے ملاقات کی۔ یہ تمام خیالات اسی بنیادی فکری غلطی سے پیدا ہوئے ہیں کہ انسان نے اپنے دائرۂ علم میں رہنے کے بجائے اس میدان میں قدم رکھ دیا جہاں جانے کا کوئی ذریعۂ علم ہمارے پاس موجود نہیں۔

قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ محکمات ہی دین کی اصل بنیاد ہیں، کیونکہ وہ غیر مبہم اور قطعی دلائل پر مشتمل ہیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ خدا کہاں ہے اور اس کی کیفیت کیا ہے، اس لیے کسی صوفی، شیخ یا بزرگ کے روحانی تجربات کو خدا کی حقیقت کا ذریعہ ماننا نہ صرف غیر علمی ہے، بلکہ دینی لحاظ سے بھی محلِ نظر ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو انسانی تجربے کے دائرے میں نہیں لایا جا سکتا، کیونکہ وہ ہر چیز سے بلند اور ماورا ہے۔ اسی طرح جنت اور جہنم کے بارے میں بھی قرآن نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے، وہ محض تشبیہات اور مثالوں پر مبنی ہے تاکہ ہم ان کا ایک عمومی تصور حاصل کر سکیں۔ جب قرآن کہتا ہے کہ ''جو تم چاہو گے، وہ تمھیں جنت میں ملے گا'' تو اس کا حقیقی مفہوم اور کیفیت انسانی فہم سے باہر ہے۔ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ جنت کی اصل حقیقت کیا ہے اور وہ اس وقت کس حالت میں موجود ہے، کیونکہ اس کا مشاہدہ ہم نے خود نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حقائق کو مثالوں کے ذریعے سے بیان کیا ہے تاکہ انسانی ذہن کو ایک عمومی آگاہی دی جا سکے، لیکن ان کی حتمی حقیقت کا ادراک نہ کیا جائے۔

لہٰذا، متشابہات کی غیر ضروری تاویل اور ان کی حقیقت کی کھوج میں پڑنا فکری گم راہی کا سبب بنتا ہے۔ قرآن نے اس روش کو ان لوگوں کا طرزِ فکر قرار دیا ہے جن کے دلوں میں انحراف پایا جاتا ہے۔ دین کو سمجھنے کے لیے محکمات پر توجہ مرکوز رکھنا ہی علمی دیانت کا تقاضا ہے، جب کہ متشابہات کے پیچھے پڑ کر ان کی غیر ضروری تشریح اور قیاس آرائی میں مبتلا ہونا محض غیر مستند اور قیاسی علمی روایت کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔

[باقی]

مولانا امین احسن اصلاحی

روزہ اور برکاتِ روزہ*

[مختارات کا حصہ قدیم و جدید مصنفین کی منتخب تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مقصد ماضی اور حال کے فکر و نظر کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں ماضی کے نمایندہ اہل علم کی تصانیف سے ایسے اقتباس نقل کیے جاتے ہیں، جو ان کے افکار اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی موثر اور معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اِس حصے کے مندرجات سے مدیر اور ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

شہوات اور خواہشات نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے، بالخصوص تزکیۂ نفس کے جتنے طریقے بھی صحیح یا غلط دنیا میں اب تک اختیار کیے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے

---

* یہ مضمون مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب ''تزکیۂ نفس'' سے لیا گیا ہے۔

آداب و شرائط، اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے، اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفس انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زور دار ہیں، ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال، ہیجان اور جوش ہے، اس وجہ سے ارادہ کو ان پر قابو پانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجاے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی تدبیریں سوچیں اور اختیار کیں، لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزا میں سے ہیں، جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہ سوار بڑی ریاضتوں، بڑی مشقوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لیے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفس انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوت ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدود الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقت ور ہو جائے۔ اپنے اس دوطرفہ عمل کے

سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے۔

روزے کی برکات

روح ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روح ملکوتی کا حقیقی میلان ملاءِ اعلیٰ کی طرف ہے۔ وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لیے پرواز کرنا چاہتی ہے، روح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں، جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو پھر نہ صرف یہ کہ اس کی قوت پرواز ختم ہو جاتی ہے، بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

روزہ اس صورت حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات و خواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دل چسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روح ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لیے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں، سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں، لیکن روزے میں دنیا اور لذات دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں مشقت اٹھاتا ہے، وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترک دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے، وہ اس کا خاص حصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیت نفس کے لیے اس کو پسند فرمایا ہے، اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لیے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالم ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالم لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو، جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ”قال اللّٰہ: کل عمل ابن آدم له إلا الصیام فإنّه لی وأنا أجزی به. والصیام جُنة. و إذا کان یوم صوم أحدکم فلا یرفث ولا یصخب فإن سابّه أحد أوقاتله فلیقل: إنّی امرؤ صائم. والذی نفس محمد بیده، لخلوف فم الصائم أطیب عند اللّٰہ من ریح المِسك. للصائم فرحتان یفرحهما: إذا أفطر فرح وإذا لقی ربّه فرح بصومه“. (بخاری، رقم 1904)

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے، مگر روزہ، یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہے کہ بھائی، میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے

نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ
ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں:
ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے
جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس
وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے رب سے
ملے گا۔“

مزید روایات میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کو بھی یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

یترك طعامه و شرابه و شهوته من أجلي. الصيام لي وأنا أجزي به. والحسنة بعشر أمثالها.
(بخاری، رقم 1795)

”(اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے۔“

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ”كلّ عمل ابن آدم يُضاعف الحسنة عشر أمثالها إلىٰ سبع مأة ضعف، قال اللّٰه عزّوجلّ: إلاّ الصوم فإنه لي وأنا أجزي به يدع شهوته وطعامه من أجلي، للصائم فرحتان: فرحة عند فطره و فرحة عند لقاء ربّه. ولَخلوفُ فيه أطيب عند اللّٰه من ريح المِسكِ“.
(مسلم، رقم 1151)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل بڑھایا جائے گا، یعنی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی، مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش اور اپنا کھانا پینا میرے لیے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، دوسری خوشی اس

کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل
ہو گی۔ اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے
نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ
ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے۔

اس کو اپنے لیے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے، جن کا اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادی خوشیاں اور تمام مادی لذتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لیے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس نے اسے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لیے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات و خصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجیے، ایک نیکی ساز گار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیے، وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہو گا اور ہر حق دار اس اجر کو حاصل کر لے گا، لیکن روزے کی جو عبادت ہے، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے، بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہو گا، جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ جب جزا دینے کا وقت آئے گا، تب وہی اس کو کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزہ رکھنے والے کو صلہ دے گا۔ جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہو گا، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین سب کا مالک اس کی کیا جزا دے گا۔

سد ابواب فتنہ

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں، روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے، جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے، بطن اور فرج ہیں، انھی کے سبب سے آدمی نہ جانے خود کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں جن سے شیطان انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے جنت کی ضمانت دی ہے، جو شخص ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

> ”حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں کلوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہیں، میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔“
>
> (بخاری، رقم 6109)

روزہ ان کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ انسان کے لیے روزے میں صرف کھانا پینا ہی حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ لڑنا جھگڑنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور غیر ضروری باتوں میں حصہ لینا بھی روزے کے مقصد کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روزے میں صرف شہوانی تقاضوں کا پورا کرنا ہی حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ تمام چیزیں بھی روزے کے منشا کے خلاف ہیں، جو اس کے شہوانی میلانات کو شہ دینے والی ہوں۔ روزہ خود بھی ان میلانات کو ضعیف کرتا ہے اور روزہ دار کو بھی ہدایت ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو ان تمام مواقع سے دور رکھے جہاں سے اس کے ان رجحانات کو غذا بہم پہنچ جانے کا امکان ہو۔

فتنہ کے دروازوں کے بند ہو جانے سے اس کے لیے ان کاموں کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے، جو خدا کی رضا کے کام ہیں اور جن سے جنت حاصل ہوتی ہے اور ان کاموں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف کام ہیں اور جن کے سبب سے آدمی دوزخ میں پڑے گا۔

شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری چوکڑی بھول جاتی ہے۔ وہ ڈھونڈتا ہے، لیکن اس کو روزہ دار پر حملہ کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہی حقیقت ہے جو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”إذا دخل شهر رمضان فُتِّحَتْ أبواب السماء وغُلِّقت أبواب جهنم وسُلْسلت الشياطين“. (بخاری، رقم 1800)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان کا مہینا آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔“

قوت ارادی کی تربیت

روزے کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کی قوت ارادی کی بہترین طریقہ پر تربیت کرتا ہے۔ شریعت کے حدود کی پابندی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کی قوت ارادی نہایت مضبوط ہو۔ بغیر مضبوط قوت ارادی کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص شہوات و جذبات اور خواہشات کے غیر معتدل ہیجانات کو دبا سکے اور جو شخص ان کے مفرط ہیجان کو دبا نہیں سکتا، اس کے لیے یہ محال ہے کہ وہ شریعت کے حدود کو قائم رکھ سکے۔ ایک ضعیف اور لجلجے ارادہ کا آدمی ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی چیز اس کے غصہ کو اشتعال دلانے والی سامنے آ جائے گی، وہ بڑی آسانی سے اس سے مغلوب ہو جائے گا؛ جب بھی کوئی طمع پیدا کرنے والی چیز اس کو اشارہ کر دے گی، وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جہاں بھی کوئی چیز اس کو اکسانے والی نظر آ جائے گی، وہیں وہ پھسل کے گر پڑے گا۔ اس طرح کی ضعیف قوت ارادی کا انسان دنیا میں عزم و ہمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ وہ شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کر سکے۔ بالخصوص شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے، مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی صبر سے وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو روزے کا اصل مقصود ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ183:2)

”اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔“

تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو، یعنی تا کہ صبر اور برداشت کی تربیت سے تمھاری قوت ارادی مضبوط ہو اور تمام ترغیبات و تحریکات اور تمام مشکلات و موانع کا مقابلہ کر کے تم شریعت کے حدود پر قائم رہ سکو۔

یہی قوت مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک سکتا ہے، جو وہ خواہشات و جذبات اور شہوات کی راہ سے اس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس حدیث میں، جو اوپر گزر چکی ہے، روزے کو ایک ڈھال کہا گیا ہے اور روزہ دار کو یہ ڈھال استعمال کرنے کی تعلیم یوں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کر دے تو اس سے کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

جذبۂ ایثار کی پرورش

روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے ایک ہے، جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں، فاقہ کشوں، محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب و روز کا اندازہ کرنے کا بہ ذات خود موقع ملتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس کا مزہ چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پڑتا ہے، کسی پر کم پڑتا ہے، کسی پر زیادہ۔ لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں، ان پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے۔ جن کا جذبۂ ایثار کم زور ہوتا ہے، روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کر دیتا ہے اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے، ان کے لیے تو روزوں کا مہینا اس جذبہ کے ابھرنے کے لیے گویا موسم

بہار ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تر دستیاں اور فیض بخشیاں یوں تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھیں، لیکن رمضان کا مہینا تو گویا آپ کے جود و کرم کا موسم بہار ہوتا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أجود الناس بالخیر و کان أجود ما یکون فی رمضان۔(بخاری، رقم 6)	”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو گویا آپ سراپا جود و کرم ہی بن جاتے۔“

قرآن مجید سے مناسبت

قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ روزے کی حالت میں بہت سے دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور نفس کے میلانات ورجحانات میں، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاموشی، خلوت، غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی، جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے، قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت اتاری جب آپ غار حرا میں معتکف تھے۔ نیز قرآن مجید کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مبارک مہینے کو منتخب فرمایا اور اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس پورے مہینے میں روزے رکھنا امت پر فرض قرار دیا۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر شب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قراءت قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور جتنا قرآن مجید نازل ہو چکا ہوا ہوتا تھا، اس کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں تراویح میں قرآن کے سننے اور سنانے کی جو اہمیت ہے، وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ قرآن مجید کو روزوں سے اور روزوں کو قرآن مجید سے گہری مناسبت ہے۔

تبتل الی اللہ

روزے کی اصل غایت دل، دماغ، جسم اور روح سب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں تبتل الی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مقام آدمی کو روزے سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے روزے کے ساتھ اعتکاف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اعتکاف اگرچہ ہر شخص کے لیے رمضان کے روزوں کی طرح ضروری چیز نہیں ہے — بلکہ یہ اختیاری عبادت ہے — لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر رمضان کے آخری عشرہ میں، جب کہ روح میں تجرد و انقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ایک خاص کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے، آدمی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو اس سے روزے کا جو اصل مقصود ہے، وہ کمال درجہ حاصل ہو تا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں جو اہتمام فرماتے تھے، اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح فرماتی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل العشر أحيا الليل و أيقظ أهله وجدّ وشدّ المئزر. (مسلم، رقم 1174)

”جب رمضان کا آخری عشرہ آتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب بیداری فرماتے، اپنے اہل و عیال کو بھی شب بیداری کے لیے اٹھاتے اور کمر کس کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے۔“

محمد ذکوان ندوی

قاری یا صاحبِ قرآن

[زیر نظر مقالہ اِس سے قبل ماہنامہ ”اشراق“ ہند (مئی 2022ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اب ماہِ رمضان المبارک کی نسبت سے، اِسے مزید اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن آپ کی سیرت اور آپ کا عملی اُسوہ تھا: ’کان خُلُقُ رسُولِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم القرآن‘ (مسند احمد، رقم 25813)، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق قرآنی ہدایات کے عین مطابق تھے۔ قرآن ہی آپ کی پسند وناپسند اور آپ کے قول وعمل کا معیار بن گیا تھا۔ گویا آپ صرف قاری نہیں، بلکہ خود ایک زندہ قرآن تھے۔

سیرتِ رسول کے مطابق، قاری وہ ہے جو کتاب اللہ کی رہنمائی میں چل کر خود ایک چلتا پھرتا قرآن بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں آج کل کی طرح محض تجوید اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں کو ”قاری“ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اُس وقت ”قاری“ سے مراد قرآن کے الفاظ ومعانی کا عالم اور اُس کے حدود کو ملحوظ رکھ کر زندگی گزارنے والا انسان تھا۔

قاری کا اصل مفہوم

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی (وفات: 852ہجری) کتاب ”فضائل القرآن“ (بَابُ القُرّاءُ مِنْ أَصْحابِ رسُولِ اللّٰہ صَلی اللّٰہُ علیہ وسلّم) میں لفظ ’القُرّاء‘ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’أی

الذین اشتهروا بحفْظِ القرآنِ والتصدّیٰ لِتعْلیمِه. وھذا اللفظُ کان فی عُرُفِ السّلَفِ أیضاً لِمَنْ تفقّه فیْ القرآن' (فتح الباری 9/60)، یعنی 'قاری' یا 'قراء' سے مراد حفظِ قرآن اور اُس کی تعلیم و تعلم میں منہمک رہنے والے حضرات ہیں۔ نیز 'قاری' یا 'قراء' کا یہ لفظ اِسی طرح سلف کے درمیان اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو قرآن میں تفقہ کا درجہ رکھتا ہو۔

قرآن کے علم و عمل کو اُس سے الگ کر کے محض تجوید اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں کے لیے 'قاری' کی اصطلاح ایک مبتدعانہ اصطلاح ہے، جو رسول اور اصحابِ رسول کی زندگی میں بالکل ایک اجنبی ظاہرے کی حیثیت رکھتی تھی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وفات: 1176 ہجری) نے قرآن میں تفقہ کے بجائے تجوید و قراءت میں غیر ضروری انہماک (تعمّق الناس فی تجوید القرآن) کو دورِ آخر کے فتنوں میں سے ایک فتنہ قرار دیتے ہوئے باقاعدہ ایک عنوان قائم کر کے اُس کے تحت اِس ظاہرے پر نکیر کے لیے چند اقوالِ رسول نقل کیے ہیں۔ مثلاً ذیل میں درج ایک روایت ملاحظہ فرمائیں:

سیدنا جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن پڑھ رہے تھے۔ ہمارے درمیان عجمی اور بدو لوگ بھی تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ دورانِ گفتگو میں آپ نے فرمایا: 'اقرؤوا فکُلّ حَسَن، وسَیَجِیْئُ أقوامٌ یُقیمُونه کما یُقام القِدْحُ، یتعجّلونه ولا یتأجّلونه' (ابو داؤد، رقم 830)، یعنی پڑھو، سب ٹھیک پڑھ رہے ہیں۔ عنقریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو قرآن کے حروف کو تیر کے مانند ٹھیک کریں گے۔ اِس قراءت سے اُن کا مقصد محض دنیا کا حصول ہو گا۔ وہ اِس سے اجرِ آخرت کے امیدوار نہ ہوں گے (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء 1/203)۔

قرآن میں تفقہ کے بجائے تجوید و قراءت میں غیر ضروری انہماک پر روشنی ڈالتے ہوئے امام ابو حامد الغزالی (وفات: 505 ہجری) اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں فرماتے ہیں:

وحجب الفهم أربعة: أولها أن یَکونَ الْهَمُّ مُنْصَرِفًا إِلَى تَحْقِيقِ الْحُرُوفِ بإخراجها من مَخَارِجِهَا، وَهَذَا يَتَوَلَّى حِفْظَهُ شَيْطَانٌ وُكِّلَ	''فہم قرآن کے راستے میں چار رکاوٹیں حائل ہیں، اِن میں سے ایک یہ ہے کہ ساری توجہ حروف کو مخارج سے نکالنے کی طرف مبذول کر دی جائے۔ اِس عمل کا

بِالْقُرَّاءِ لِيَصْرِفَهُمْ عَنْ فَهْمِ مَعَانِي كَلَامِ اللّٰهِ عَزَّ وجل، فلا يزال يَحمِلهم على ترديدِ الحَرْفِ يُخَيِّلُ إِلَيْهِمْ أَنَّه لَمْ يَخْرُجْ مِنْ مَخْرَجِه. فَهَذَا يَكُونُ تَأَمُّلُه مَقْصُورًا عَلَى مَخَارِجِ الْحُرُوفِ فَأَنَّى تَنْكَشِفُ لَهُ الْمَعَانِي؟ وَأَعْظَمُ ضُحْكَةٍ لِلشَّيْطَانِ مَنْ كان مُطِيعًا لِمِثْلِ هذا التلبيسِ. (1/669)

ذمے دار ایک شیطان ہے جو اِن قاریوں پر مسلط کر دیا گیا ہے، تاکہ وہ اُنھیں قرآن مجید کے معانی کو سمجھنے کے بجاے دوسری طرف پھیر دے، چنانچہ وہ مسلسل اِن قاریوں کو حروف کے باربار ادا کرنے کی طرف پھیرتا رہتا ہے اور بار بار یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ یہ حرف اپنے مخرج سے نہیں نکلا۔ ایسی حالت میں، جب کہ قاری کی تمام تر توجہ محض مخارجِ حروف پر مبذول ہو کر رہ جائے تو پھر اُس پر قرآن کے معانی کس طرح منکشف ہو سکتے ہیں؟ ایسا شخص جو شیطان کی طرف سے پیدا کردہ اِس قسم کے فریب میں مبتلا ہو جائے، وہ شیطان کے لیے صرف ایک عظیم مضحکہ بن کر رہ جاتا ہے۔“

قرآن کی مطلوب قراءت

خوش الحانی یا حسنِ صوت ہرگز کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ اِس کا اہتمام مطلوب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’زَيِّنُوا القرآنَ بأصواتِكم‘ (ابوداؤد رقم 1468)، یعنی اپنے حسنِ صوت کے ذریعے سے تلاوتِ قرآن کو خوب صورت بناؤ۔

البتہ، اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک وہی خوش الحانی مطلوب ہے جو مصنوعی نہ ہو، جس میں خود پڑھنے والے کی شخصیت شامل ہو گئی ہو، جس میں محض اداے مخارج اور عجمی اِشباع کے بجاے خونِ دل و جگر سے نوا کی پرورش کی گئی ہو اور رگِ ساز میں خود صاحبِ ساز کا لہو رواں دکھائی دے رہا ہو۔

چنانچہ طاؤس بن کیسان تابعی (وفات: 106 ہجری) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اچھی آواز اور بہترین تلاوت کس کی ہے؟ آپ نے فرمایا: 'مَنْ إذا سَمِعْتَه يَقْرأ، أُرِيْتَ أنّه يَخْشَى اللهَ' (سنن الدارمی، رقم 3490)، یعنی سب سے اچھی تلاوت اُس قاری کی ہوتی ہے، جس کو تم پڑھتے ہوئے سنو تو محسوس ہو کہ اُس پر اللہ کا خوف طاری ہے۔ گویا یہی وہ علما اور قراء ہیں جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے: 'إنّهم إذا رُؤوْا، ذُكِرَاللهُ' (تخریج المسند، شعیب الارنؤط، رقم 27599)، یعنی وہ سچے اہل ایمان جنھیں دیکھ کر خدا یاد آجائے۔

تغنی بالقرآن

اِس سلسلے میں احادیث و آثار کی مختلف روایتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ایک ارشاد اِن الفاظ میں نقل ہوا ہے: 'ليسَ منّا مَنْ لمْ يتغنَّ بالقرٰان' (بخاری، رقم 7527)، یعنی جو شخص قرآن کو پا کر بھی غنی نہ ہو سکا، وہ ہم میں سے نہیں۔

اِس ارشادِ رسول کا عام مطلب محض خوش الحانی لیا گیا ہے۔ تاہم تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں جو چیز زیر بحث ہے، وہ صرف خوش الحانی نہیں، بلکہ قرآن کے ساتھ گہرا فکری اور عملی تعلق ہے۔

اِس روایت کی درست تشریح وہ ہے، جو سفیان ابن عیینہ تابعی کی نسبت سے بیان کی گئی ہے۔ اُن کے نزدیک اِس 'استغناء' سے مراد ایک خاص قسم کا استغنا (استغناءٌ خاصٌ) ہے، یعنی ہدایت کے معاملے میں قرآن کے سوا ہر دوسری چیز سے آدمی کا بے نیاز ہو جانا (وأنه يستغنى به عن غيره من الكتُب)۔

اِس روایت کی تشریح کے ذیل میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: 'فيكون معنى الحديث: الحَثُّ علىٰ مُلازمةِ القرٰانِ وأن لا يتعدّىٰ إلىٰ غيرِه' (فتح الباری، کتاب: فضائل القرآن، باب مَن لم يتغنّ بالقرآن)، یعنی حدیث کا مطلب ہو گا: گہری وابستگی کے ساتھ پورے دل و جان سے قرآن مجید کو لازم پکڑ لینا اور اُس سے آگے تجاوز نہ کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کے دور میں قاری یا عالم سے مراد معروف قاری یا عالم نہیں ہوا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (وفات: 58 ہجری) بیان فرماتی ہیں کہ 'مَن

أَخَذ السبْعَ الأُوَلَ مِنَ القرآن فهو حَبْرٌ‘ (تخریج المسند، رقم 24531)، یعنی جس شخص نے قرآن کی ابتدائی سات سورتوں —البقرہ تا الاعراف— کا علم حاصل کرلیا، وہ قرآن کا بڑا عالم شمار ہو گا۔

سیدنا حسن بصری (وفات: 110ہجری) فرماتے ہیں: ’وأهلُ القرآن: هُم الذين يتلونه حقَّ تلاوته، وهمُ العاملون بما فيه، وإنْ لمْ يَحْفظُوه عنْ ظَهْرِ قلبٍ‘ (کتاب الزہد، ابن المبارک 274)، یعنی سچے قراء وہی ہیں جو قرآن کی تلاوت کا حق ادا کریں؛ جو اُس پر عمل کریں، خواہ انھوں نے پورے قرآن کو حفظ نہ کیا ہو۔

اِسی طرح انھوں نے فرمایا: ’إنّ أولى الناسِ بهذا القرآنِ مَن اتَّبعه، وإنْ لم يكنْ يقرؤه‘ (فضائل القرآن، ابو عبید 136)، یعنی قرآن مجید سے نسبت کا سب سے زیادہ حق دار وہی شخص ہے جو اُس کی اتباع کرے، خواہ اُس نے (قراء کی طرح) قرآن نہ پڑھا ہو۔

حافظ ابن القیم (وفات: 751ہجری) لکھتے ہیں: ’وأما مَنْ حفظه ولم يعملْ بما فيه، فليسَ مِنْ أهلِه، وإن أقام حروفَه إقامةَ السّهم‘، یعنی جس شخص کا حال یہ ہو کہ اُس نے قرآن مجید کو حفظ کیا، مگر اُس پر عمل نہ کیا تو ایسا آدمی قاری یا صاحبِ قرآن کہلائے جانے کا مستحق نہیں، خواہ وہ تیر کی طرح قرآن کے حروف و مخارج کو درست کر کے اُس کی تلاوت کر رہا ہو (زاد المعاد 1/ 328)۔

قراءت اور ’صاحبِ قرآن‘ کے اوصاف

☆ ’صاحبُ القرآن: هو الذي يَقْرَءه ويعملُ به، وليسَ الذي يَقْرَءه فقط، دُونَ أن يَعْمَلَ به‘ (شرح ابی داؤد، عبد المحسن العباد 3/ 177)، یعنی ’صاحبِ قرآن‘ سے مراد وہ شخص ہے، جو اُسے پڑھے اور اُس پر عمل کرے۔ صرف بے عمل قاری ’صاحبِ قرآن‘ نہیں ہو سکتا۔

☆ ’قارِئُه حَقَّ قراءته، بتلاوته وتدبُّرِ مَعناه‘ (فیض القدیر، مناوی 2/ 505)، یعنی قاری سے مراد تلاوت اور اُس کے معانی پر غور و فکر کرتے ہوئے کتاب اللہ کے شایانِ شان پڑھنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ صرف الفاظ کے قاری ہوں، وہ سیدنا حسن بصری کے اِن الفاظ کا مصداق قرار پائیں گے: ’حَفِظوا حُروفَه و ضَيّعوا حُدودَه‘ (تفسیر النسفی 4/ 38)، یعنی الفاظِ

قرآن کے حافظ، مگر اُس کے حدود و فرائض کو ضائع کرنے والے۔ اِسی طرح سیدنا حسن بصری نے فرمایا: ایک شخص کہے گا کہ میں نے پورا قرآن پڑھ لیا، حالاں کہ اُس کے کردار و عمل میں قرآن کا کوئی بھی اثر دکھائی نہیں دے گا(حتّیٰ إنّ أحدَهم ليقول: قرأتُ القرآنَ كُلَّه، وما يُرى له القرآن في خُلُقٍ، ولا عمَلٍ. تفسیر ابن کثیر 4/ 43)۔

☆ سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (وفات: 65 ہجری) کے مطابق، آپ نے فرمایا: 'اقْرَأ القرآنَ مَا نَهَاك عنه، فإذا لم يَنْهك، فلَسْتَ تَقْرَؤُه' (الطبرانی، رقم 14543، مسند الشہاب، رقم 392)، یعنی قرآن کو اِس طرح غور و فکر کے ساتھ پڑھو کہ وہ تم کو اللہ کی نافرمانی سے روک دے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر گویا تم نے قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔

چنانچہ قرائے صحابہ اور اصحابِ رسول کا حال یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھتے اور جب تک اِن آیات پر پوری طرح عامل نہ ہو جاتے، اُس وقت تک ہرگز اِس سے آگے نہ بڑھتے تھے: 'كان الرّجلُ منّا إذا تَعلّمَ عَشرَ آياتٍ لمْ يُجاوِزْهنّ، حتىّ يَعرِفَ معانيهنّ والعملَ بهنّ' (طبقات ابن سعد 6/ 172، سیر اعلام النبلاء، الذہبی 4/ 269)۔

☆ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ (وفات: 93 ہجری) کی روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: 'يَخرجُ قومٌ في آخِرِ الزمان، يقرؤون القرآنَ، لا يُجاوِزُ تراقِيَهُمْ' (صحیح الجامع، رقم 8054)، یعنی دورِ آخر میں کچھ لوگ اٹھیں گے۔ وہ قرآن کو پڑھیں گے، مگر وہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا(وہ قرآن سے محض الفاظ کے درجے کا تعلق رکھیں گے، وہ اُسے اپنے قول و عمل کا حصہ نہیں بنائیں گے)۔

☆ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ (وفات: 38 ہجری) کے مطابق، آپ نے فرمایا: 'ما آمنَ بالقرآن مَن اسْتَحَلّ مَحارِمَه' (تخریج مشکوٰۃ المصابیح، ابن حجر 2/ 397)، یعنی جو شخص قرآن کے ممنوعات و محرمات سے اپنے آپ کو نہ روکے، وہ اُس کا مومن نہیں۔

☆ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ (وفات: 31 ہجری) نے ایک حافظِ قرآن کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: 'إنّما جمعَ القرآنَ مَنْ سَمِعَ له وأطاعَ' (فضائل القرآن، ابو عبید 133)، یعنی یاد رکھو، قرآن کو اُسی شخص نے اپنے سینے میں جمع کیا، جس نے اُس کی بات سنی اور اُس کی پیروی اختیار کی۔

☆ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (وفات: 73 ہجری) فرماتے ہیں: 'كان الفاضلُ مِنْ

أصحابِ رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی صَدْرِ ھذہ الامۃ،لا یَحفظُ منَ القرآنِ إلا السُورۃَ منَ القرآنِ و نَحْوَھا، ورُزِقوا العَمَلَ بالقرآن. وإنّ آخِرَ ھذہ الامۃِ یَقرؤوْنَ القرآنَ، منھمُ الصَّبِیُّ والاعمیٰ، ولا یُرْزَقونَ العَمَلَ بہ‘(مقدمۃ الجامع لاحکام القرآن، القرطبی 1 / 39)، یعنی اِس امت کے دورِ اول (ابتداے اسلام) میں فضلاے صحابہ کا بھی یہ حال تھا کہ اُنھیں صرف ایک سورہ یا اِس کے برابر ہی قرآن کا کوئی حصہ یاد ہوا کرتا تھا، مگر اُنھیں قرآن پر عمل کی توفیق حاصل تھی۔ اِس کے برعکس، اِس امت کے دورِ آخر میں پیدا ہونے والے لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ اُن کے بچے اور نابینا افراد بھی قرآن کو پڑھیں گے، مگر اِس کثرت کے ساتھ قرآن پڑھے اور پڑھائے جانے کے باوجود وہ قرآن پر عمل کی توفیق سے محروم رہیں گے۔

☆ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’إنّا صَعُبَ علینا حِفْظَ ألفاظِ القرآن، وسَھُلَ علینا العملُ بہ. وإنّ مَنْ بَعْدَنا، یَسْھُلُ علیھمْ حفظَ القرآنِ ویَصْعَبُ علیھمُ العَمَلَ بہ‘(مقدمۃ الجامع لاحکام القرآن، القرطبی 1 / 40)، یعنی ہم اصحابِ رسول کے لیے قرآن کو حفظ کرنا مشکل اور اُس پر عمل کرنا آسان تھا۔ مگر اِس کے برعکس، ہمارے بعد کے مسلمانوں کے لیے قرآن کو حفظ کرنا آسان اور اُس پر عمل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

☆ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (وفات: 40 ہجری) سے مروی ایک طویل روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: ’...ولا یَدَعُ القرآنَ رغبۃً عنہُ إلیٰ ما سِوَاہُ. . .ألا، لا خیرَ فی قراءۃٍ لیسَ فیھا تدبُّرٌ‘(جامع بیان العلم، ابن عبد البر 2 / 811)، یعنی سچا قاری اور فقیہ وہ ہے جو قرآن سے بے رغبتی اختیار کر کے اُس کے سوا کسی اور چیز کی طرف متوجہ نہ ہو۔ یاد رکھو، اُس قراءت (تلاوت) میں کوئی خیر نہیں، جس میں تدبر شامل نہ ہو۔

☆ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ (وفات: 52 ہجری) کی روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: ’مَنْ قَرَأَ القرآنَ فلْیسألِ اللّٰہَ بہ، فإنّہ سَیَجِیئُ أقوامٌ یقرؤون القرآنَ، وَیَسْألون بِہ الناسَ‘ (ترمذی، رقم 2917)، یعنی جس شخص نے قرآن مجید کا علم حاصل کیا، اُسے چاہیے کہ وہ اُس کے ذریعے سے اللہ سے مانگے۔ عنقریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو پڑھیں گے، مگر اُس کے ذریعے سے وہ لوگوں سے محض دنیا طلب کریں گے۔

☆ مشہور تابعی سیدنا سفیان بن عیینہ (وفات: 198 ہجری) نے فرمایا: ’مَنْ أعطیَ القرآن فمدّ

عینیہ إلی شئٍ ممّا صغّر القرآنَ، فقد خالفَ القرآن‘ (شرح صحیح البخاری، ابن بطّال 10 / 264)، یعنی جس شخص کو قرآن مجید کا علم عطا ہو، اِس کے باوجود وہ اُن چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے جو قرآن کی تصغیر کر رہی ہوں تو اُس نے قرآن مجید کی مخالفت و تصغیر کی۔ اتنا کہہ کر انھوں نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: ’وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى‘، یعنی اِن منکرین کے بعض گروہوں کو دنیوی زندگی کی رونق کا جو سامان اُن کی آزمایش کے لیے ہم نے دے رکھا ہے، تم اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور یاد رکھو کہ تمھارے پروردگار کا رزق ہی تمھارے لیے زیادہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ 20:131)۔

☆ سیدنا حسن بصری فرماتے ہیں کہ ”جو لوگ قرآن کے حروف کو اچھی طرح پڑھتے اور اُس کے حدود و فرائض کو ضائع کرتے ہیں، وہ ہرگز قرائے قرآن کہلانے کے مستحق نہیں۔ اللہ کی قسم، ایسے لوگ نہ قرائے قرآن ہیں، نہ علمائے قرآن، نہ حکمائے قرآن اور نہ متقی و پرہیز گار اہل ایمان۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہمارے درمیان ایسے ’قراء‘ کی تعداد ہرگز نہ بڑھائے: ’... مَا هؤلاءِ بِالْقُرّاءِ، وَلا الْعلماءِ، وَلا الْحُكَماءِ، وَلا الْوَرِعة. لاكثَّرَ اللّٰهُ فِيْ النّاسِ مِنْ هؤلاءِ‘ (فضائل القرآن، ابو بکر جعفر بن محمد الفریابی 177)۔

☆ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (وفات: 32 ہجری) نے فرمایا: ’ينبغي لِحامِلِ القرآن أن يُعرَفَ بِليلِه إذا النّاسُ نائمون، وبِنهارِه إذا النّاسُ مُفْطِرون، وبِوَرَعِه إذا النّاسُ يَخْلِطون، وبِتواضُعه إذا النّاسُ يَختالُون، وبِحُزْنه إذا النّاسُ يَفْرَحُون، وبِبُكاءِه إذا النّاسُ يَضْحَكون، وبِصَمْتِه إذا النّاسُ يَخُوضُون‘ (کتاب الزہد، احمد بن حنبل 162۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 36734)، یعنی لوگوں کے درمیان ایک قاری اور اصل حاملِ قرآن شخص کی پہچان یہ ہونی چاہیے کہ —— وہ اللہ کے سامنے راتوں کو کھڑا ہو، جب کہ لوگ سو رہے ہوں؛ وہ دن میں روزہ دارانہ زندگی گزارے، جب کہ لوگ بے روزہ ہوں؛ وہ پرہیز گارانہ زندگی اختیار کرے، جب کہ لوگ غیر محتاط ہوں؛ وہ تواضع کا طریقہ اپنائے، جب کہ لوگ غیر متواضع ہوں؛ وہ غمگین ہو، جب کہ لوگ خوش ہوں؛ وہ رو رہا ہو، جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں؛ وہ سنجیدگی اور خاموشی کی روش اختیار کرے، جب کہ لوگ فضول باتوں میں مصروف ہوں۔

خلاصۂ کلام

مذکورہ ارشادات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا سچا قاری وہی ہے جو صرف اُس کے الفاظ کا قاری نہیں، بلکہ اپنے قول و عمل کے اعتبار سے خود ایک زندہ قرآن بن جائے۔ جیسا کہ معلوم ہے، اِس وقت ہم فتنوں کے تاریک ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اُن سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم مضبوطی کے ساتھ کتاب اللہ کو پکڑ لیں، جیسا کہ فتنوں کی کثرت کا ذکر سن کر سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اِن فتنوں سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہو گا اور وہ ہے: اللہ کی کتاب، قرآن مجید کے ساتھ گہرا قلبی تعلق (...فَمَا المَخْرَجُ منها یارَسولَ اللّٰہ؟ قال: کتابُ اللّٰہ. مسند البزار، رقم 772)۔

آخر میں ہم اِس سلسلے کی ایک اور پیغمبرانہ نصیحت پر اِس تحریر کو ختم کریں گے۔ مختلف روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ (وفات: 36 ہجری) کو تین بار تاکیدی انداز میں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: 'یا حُذیفة، علیكَ بكتابِ اللّٰہ، فتَعَلَّمْه، واتّبِعْ مافیهُ خیرًا لك' (ابن حبان، رقم 117)، یعنی اے حذیفہ، اللہ کی کتاب کو لازم پکڑ لو۔ اُسے اچھی طرح سیکھو اور اُس کی تعلیمات کا اتباع کرو۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہو گا۔

قرآن مجید کے ساتھ تذکیر و تلاوت، دعوت و عمل اور تدبر و تفکر، نیز صاحبِ قرآن سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتباع و محبت کے سوا، اب ہمارے لیے ہدایت و نجات کا کوئی اور راستہ نہیں۔ قرآن ہی وہ روشن چراغ ہے، جس کی رہنمائی میں ہم فتنوں کی اِس سیاہ تاریکی اور التباس کے اِس جنگل سے نکل کر خدا کی واضح اور روشن صراطِ مستقیم پر گام زن ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے سوا، کسی اور شخص یا کسی اور ماخذ سے خدا کی ہدایت تلاش کرنے والے کے لیے جو چیز مقدر رہے، وہ صرف بے راہی و ضلالت ہے، نہ کہ پروردگارِ عالم کی سچی ہدایت اور اُس کا مطلوب راستہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی حقیقت کا اظہار اِن پیغمبرانہ الفاظ میں فرمایا تھا: 'مَن ابْتَغیٰ الهُدیٰ مِنْ غَیرِہ، أضلّه اللّٰہُ' (ترمذی، رقم 2906)۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(19)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

قیام پاکستان کے وقت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے اہل خانہ جالندھر میں قیام پذیر تھے۔ یاد رہے کہ یہاں ان کا سسرال تھا۔ وہ خود پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کے مرکز میں تھے۔ وہاں سے پاکستان جانے کا فیصلہ ہوا تو وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور دوسرے قائدین کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ ان حالات کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔

مولانا کے اہل خانہ ان سے لاہور آ کر ملے اور انھیں اور جماعت کے متعدد دوسرے لوگوں کو حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی ایک جگہ پر قیام کی اجازت مل گئی، لیکن یہ بالکل عارضی بندوبست ثابت ہوا۔ حکومت نے اسے خالی کرنے کا حکم دیا اور کچھ وقت خیموں میں گزارنے کے بعد یہ لوگ اسلامیہ پارک منتقل ہو گئے۔ وہاں سے مولانا مودودی ذیلدار پارک اچھرہ چلے گئے، جب کہ

مولانا اصلاحی مختلف جگہوں پر نقل مکانی کرتے رہے۔ اسی دوران میں انھیں جماعتی سرگرمیوں کے لیے راولپنڈی بھیج دیا گیا۔

جماعت اسلامی کا حکومت پاکستان سے اختلاف

جماعت اسلامی کا معاملہ یہ تھا کہ اس نے قیام پاکستان کی خاموش حمایت تو کی تھی، لیکن وہ برملا مسلم لیگ کی قیادت کی ناقد تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اراکین اور قیادت کانگرس اور انگریزی حکومت کی پالیسیوں کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔

اس پس منظر میں قیام پاکستان کے چند مہینے پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں بہت زیادہ بدگمانی پیدا کر دی۔ اس بدگمانی کے بعد میں بڑے تلخ نتائج سامنے آئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اپریل 1947ء میں پٹنہ میں جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع میں جماعت نے اپنی پالیسی کے تحت اپنے وقت کی بڑی سیاسی جماعتوں کے بڑے لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی۔

پٹنہ کے مذکورہ جلسے میں سوائے کانگرس کے کسی رہنما نے شرکت نہیں کی، جب کہ کانگرس کے طرف دار اور پورے برصغیر کے ہر دل عزیز لیڈر مہاتما گاندھی نے اس میں شرکت کی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پورے برصغیر میں گاندھی جی واحد لیڈر تھے جنھیں عالمی شہرت بھی حاصل تھی۔ اس سطح کے لیڈر کی جماعت اسلامی جیسی بالکل نئی اور بہت کم معروف جماعت کے جلسۂ عام میں شرکت بہت معنی خیز تھی۔ اس کی بہت زیادہ شہرت ہوئی۔

دوسری دل چسپ بات یہ ہوئی کہ اس جلسے میں مولانا مودودی علالت کے باعث شرکت نہ کر سکے اور دستور کے مطابق جماعت کے نائب امیر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اس میں امیر جماعت اسلامی کی حیثیت سے اختتامی تقریر کی۔

گاندھی جی نے مولانا اصلاحی کی پوری تقریر سماعت کی۔ یہ مولانا کی گاندھی سے بالمشافہ پہلی ملاقات بھی تھی۔ تقریر کے بعد گاندھی جی نے مولانا اصلاحی کی تقریر کی بہت تحسین کی۔ انھیں اعلیٰ پائے کا مقرر تسلیم کیا اور تقریر کے نکات کو قابلِ غور قرار دیا۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں مذہبی اور قومی تفریق سے بالاتر ہو کر انسانی سطح پر مسائل کا حل تلاش کرنا

چاہیے اور انسانی فلاح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے میں مضمر ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قرآن کی توحید اور اس کا عالمی پیغام واضح کیا۔

گاندھی جی کی شرکت سے جماعت اسلامی، کانگرس اور مسلم لیگ میں کئی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی روداد حصہ پنجم میں اس سارے واقعے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت کے سالانہ اور حلقہ وار اجتماعات میں آخری اجلاس کو عام خطاب کی غرض سے جلسۂ عام کی شکل دی جاتی تھی۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم، عوام اور خاص، دونوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی تاکہ وہ جماعت کی دعوت سے واقف ہوں۔

پٹنہ کے اس اجتماع میں اخبارات کے ذریعے سے مسلم لیگ، خاکسار تحریک، جمعیت علماے اسلام اور کانگرس کے بڑے لیڈروں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان دنوں بہار کے فسادات کے سلسلے میں گاندھی جی پٹنہ آئے ہوئے تھے، اس لیے ان کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ گاندھی جی کو خاص طور پر مدعو نہیں کیا گیا تھا، جیسا کہ کانگریسی اخبارات نے دعویٰ کیا تھا۔ اس کے برعکس، گاندھی جی کو جلسے میں شرکت کے مخصوص شرائط بھی بتا دیے گئے تھے، جو انھوں نے پوری طرح قبول کرنے کا وعدہ کیا۔

اس اجلاس میں جماعت کے مطابق تین ہزار اور عام اخبارات کے مطابق پانچ ہزار کے قریب لوگ موجود تھے۔ مولانا کی تقریر پون گھنٹا جاری رہی۔ تقریر کے اختتام پر مولانا اسٹیج سے اتر کر نیچے دری پر آ گئے اور گاندھی جی کے پاس بیٹھے۔ غازی عبدالجبار صاحب نے مولانا اصلاحی سے گاندھی جی کا تعارف کرایا۔ گاندھی جی نے مولانا سے کہا کہ میں نے آپ کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور مجھے اسے سن کر بہت مسرت ہوئی۔ اس پر غازی صاحب نے ان سے کہا کہ ایک تقریر سے آپ کو پوری بات پانا مشکل ہے، اس لیے آپ کچھ وقت نکالیں اور ہم آپ کو اپنی دعوت کی تفصیلی تفہیم دیں گے۔ گاندھی جی نے کہا کہ سرِ دست تو میں مصروف ہوں، البتہ میں آپ کی جماعت کی دعوت کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے ضرور وقت نکالوں گا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ دوسری کسی جماعت کے کسی بھی سطح کے لیڈر نے اس اجتماع میں شرکت نہیں کی، جب کہ گاندھی جی اپنی خواتین کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔

اس واقعے کے اگلے روز مسلم لیگ کے زیر اثر حلقوں میں گاندھی جی کی شرکت پر سخت ناراضی

کا اظہار شروع ہو گیا اور کہا جانے لگا کہ ہمیں تو پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ لوگ چھپے ہوئے کانگرسی ہیں۔ بعض مقامات پر جماعت اسلامی اور اس کے کارکنوں کو علانیہ گالیاں دی جانے لگیں۔ یہ دل چسپ واقعہ بھی ہوا کہ جماعت اسلامی نے اس جلسے کے انتظامات کے لیے ایک لیگی مسلمان سے سامان کرایے پر لیا تھا۔ اُس وقت انھوں نے کسی قسم کا کرایہ وصول نہ کرنے کا عندیہ دیا، لیکن گاندھی جی کی شرکت کے بعد جب سامان واپس کیا گیا تو انھوں نے سخت زبان بھی استعمال کی اور کرایے کا بہت ناگوار طریقے سے مطالبہ کیا، جو ادا کر دیا گیا۔

دوسرے ہی روز پٹنہ کے کانگرسی اخبار ''سرچ لائٹ'' نے اپنے سنڈے ایڈیشن 27/ اپریل 1947ء میں اس واقعے کو اس طرح شائع کیا کہ جماعت اسلامی بھی اس وطن پرست مسلمان جماعتوں میں سے ایک ہے، جو لیگ کی مخالفت میں کانگرس کی ہم نوا ہیں اور یہ اجتماع اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ مسلم لیگ کی عوامی مخالفت واضح ہو اور اس کے نظریے کی تردید کی جائے۔

روداد کے مصنف کے مطابق:

> ''ہم اس جسارت پر حیران ہیں کہ ایک تقریر جو چند ہی گھنٹے پیشتر شہر کے ہزاروں آدمیوں کے سامنے کی گئی تھی، اس کی اس قدر غلط اور متعین مفہوم کے برعکس رپورٹ کیسے بے دھڑک طریقے سے شائع کر دی گئی۔''

''سرچ لائٹ'' میں یہ خبر اس شہ سرخی کے ساتھ شائع ہوئی:

> ''مسلم لیگ کا مطالبہ علیحدگی اسلام کے خلاف ہے: مسلمانوں کے جلسے میں مولانا الٰہی کی تقریر''

یعنی رپورٹر کو مولانا اصلاحی کا درست نام بھی معلوم نہ تھا۔ اور یہ کتابت یا پروف کی غلطی نہیں تھی۔ پوری خبر میں دسیوں بار مولانا اصلاحی کو ''مولانا الٰہی'' ہی لکھا گیا تھا، حتیٰ کہ جماعت اسلامی کا نام بھی غلط تحریر کیا گیا۔ اسے ''جمعیت'' لکھا گیا تھا۔

متن میں اس طرح کے الفاظ بھی لکھے گئے:

> '''''مولانا الٰہی'' نے کہا کہ مسلمانوں میں سے بعض ضدی اور جھگڑالو قسم کے لوگ نام تو اسلام کا لیتے ہیں، مگر پوزیشن انھوں نے ایسی لے رکھی ہے، جو اسلام کے خلاف اور اس کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھنے والی ہے۔''

یہی رپورٹ دوسرے اخبارات کو بھی بھیج دی گئی۔ اس طریقے سے کم و بیش تمام اخبارات نے جماعت اسلامی کے حوالے سے گاندھی جی کی شمولیت کو اسی نقطۂ نظر سے بیان کیا۔

مسلم لیگی اخبارات نے اس جھوٹی رپورٹ پر اعتماد کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے خلاف سخت مہم شروع کر دی۔ خاص طور پر ''نوائے وقت'' لاہور مورخہ 30/ اپریل کی اشاعت میں ایک طویل ادارتی نوٹ لکھا۔ عنوان تھا:

''مولانا مودودی کی خدمت بابرکت میں''

''... مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا امین احسن نے فرمایا کہ موجودہ مصائب کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلام اور نیشنلزم کو خلط ملط کر رہے ہیں جس کا نتیجہ نواکھلی، پنجاب اور بہار کے افسوس ناک واقعات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسٹر گاندھی نے بھی منتظمین کی خاص دعوت پر اس جلسہ میں شرکت کی... مولانا مودودی جن خیالات کی مسلمانوں میں تبلیغ کر رہے ہیں، وہ ہمیں ایک مدت سے معلوم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی تحریک اور کوئی جماعت مولانا کی ہم دردی کی مستحق نہیں... ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا مسلم لیگ کی تحریک سے بھی کوئی ہم دردی نہیں رکھتے اور پاکستان کو ایک نیشنلسٹ تحریک گردانتے ہوئے اپنی تائید کا مستحق نہیں سمجھتے...۔

''مولانا خود کافی محتاط ہیں اور جہاں مسلم لیگ پر غیر ہم دردانہ نقطہ چینی کرتے ہیں، وہاں کانگرس کو بھی اچھا نہیں سمجھتے، مگر ان کی جماعت کا ترجمان اخبار کسی نہ کسی رنگ میں لیگ کی تنقیص اور مسٹر گاندھی اور کانگرس کی توصیف ضرور کرتا ہے، لیکن ہمارا خیال تھا کہ مولانا سے تعَرُّض کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی صواب دید کے مطابق ایک نیک کام میں مصروف ہیں۔ خدا انھیں کامیاب کرے۔ ہم گنہگار اور محض کلمہ گو مسلمانوں سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہم کرتے ہیں اور خدا سے دعا کریں گے کہ وہ ہمیں اس سے زیادہ کی توفیق بخشے، مگر اصلاحی صاحب کی یہ تقریر عام مسلمانوں کے لیے بہت دل آزار ثابت ہوئی ہے۔ یہ تو سنا تھا کہ مولانا مودودی بھی میدانِ سیاست میں قائدانہ شان کے ساتھ اترنے والے ہیں، لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ جماعت اسلامی کے پہلے پبلک جلسہ ہی میں مسٹر گاندھی کو بلا کر یہ کچھ کہیں اور خاص بہار میں

فساد اور فتنہ آرائی کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی جائے چونکہ وہ اسلام اور نیشنلزم کو خلط ملط کر رہے ہیں۔“

اس نوٹ کے جواب میں جماعت اسلامی کی طرف سے ایک خط ایڈیٹر کے نام بھیجا گیا۔ اس کے ساتھ مولانا اصلاحی کی تقریر کا خلاصہ بھی منسلک کر کے ان سے درخواست کی گئی کہ اس خط اور اس خلاصے کو اپنی رپورٹ میں شائع فرمائیں:

”نوائے وقت مورخہ تیس اپریل 1947ء کے ایڈیٹوریل نوٹ میں ”مولانا مودودی کی خدمتِ بابرکت میں“ کے عنوان سے جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، وہ سراسر کانگرسی پریس کی غلط رپورٹ پر مبنی ہے۔ ان خبر رساں ایجنسیوں نے غیر ذمہ داری اور غلط بیانی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے اور آپ کو اس کا روز مرہ کا تجربہ ہے۔ پھر بھی آپ نے ان کی رپورٹ کو حرف بہ حرف صحیح جان سمجھ کر اس پر ایک نوٹ لکھ ڈالا۔ اس خط کے ساتھ آپ کو اصل تقریر کا خلاصہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے اخبار میں شائع فرمائیں اور اس پر جو اظہارِ رائے فرمانا چاہیں، وہ فرما سکتے ہیں۔ اس جلسے میں گاندھی جی کو کوئی مخصوص دعوت نہیں دی گئی تھی، بلکہ جیسا کہ ہمارا قاعدہ ہے کہ ہم اپنے اجتماع میں سے ایک حصہ خطابِ عام کرتے ہیں جس میں اپنے خیالات بلا تفریقِ مذہب و ملت سب کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں ہم مختلف طرزِ خیال اور مختلف جماعتوں کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہم نے اجتماع پٹنہ کے خطابِ عام کے سلسلے میں کیا تھا۔ ہماری طرف سے لیگ، خاکسار، جمعیت علمائے اسلام اور کانگرس... سب کے ذمہ دار لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور اس سلسلے میں گاندھی جی کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا تھا۔ ممکن ہے، گاندھی جی کو کسی ایسے صاحب نے خاص طور پر بھی کہا ہو جو ہماری دعوت سے دل چسپی رکھتے ہوں، مگر ہماری جماعت کے کسی کارکن نے دعوت دینے میں کسی کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں کی۔ اب یہ اور بات ہے کہ گاندھی جی نے ہمارے اجتماع میں آکر ہماری باتیں سننے کی تکلیف گوارا کی اور دوسروں نے نہ کی۔ گاندھی جی کی شرکت اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقریر کے غلط اقتباس سے ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو اثر ڈالنا چاہا ہے، وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی ان نیشنلسٹ مسلمان جماعتوں کی فہرست میں شامل ہے جو لیگ کی مخالفت میں کانگرس کی ہم نوا ہیں لیکن ہم اس فہرست میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لیے

تیار نہیں ہیں۔ اور نہ اس کو گوارا کر سکتے ہیں کہ ایسی غلط پوزیشن ہماری طرف منسوب کی جائے۔ لیگ سے اگر ہمیں کوئی اختلاف ہے تو اس بنا پر ہے کہ ہم اس کو سو فی صدی اسلام کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، نہ کہ اس بنا پر کہ وہ ہندوستان کے نیشنلزم میں کانگرس کی ہم نوائی کیوں نہیں کرتی۔

خاکسار قیم جماعت اسلامی

طفیل محمد“

[باقی]

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

علامہ الطاہر بن عاشور: حیات اور علمی خدمات

(1879ء-1973ء)

علامہ الطاہر ابن عاشور بیسویں صدی کے تجدیدی و اصلاحی فکر کے مشہور تیونسی عالم ہیں۔ وہ عالم عرب میں تو بہت معروف ہیں، مگر برصغیر میں ان کی کتابوں اور تحریروں کے ترجمے بہت دیر میں پہنچے، اس لیے یہاں کے اہل علم ان سے تقریباً ناواقف رہے ہیں۔ چنانچہ اردو میں کوئی چیز ان کی تحریروں، ان کی شخصیت اور فکر سے متعلق راقم کی محدود و ناقص نظر سے نہیں گزری۔

ابن عاشور مفسرِ قرآن، محدث، شارح بخاری اور اصولی فقیہ تھے، جن کی تفسیر ''التحریر والتنویر'' عرب علما میں متداول ہے۔ اس کے علاوہ ان کا بڑا تعارف علم مقاصد الشریعہ کے بانی اور نظریہ ساز اصولی فقیہ امام شاطبی غرناطی (متوفی 1388ء) کے شارح و ترجمان کی حیثیت سے بھی ہے۔ موجودہ زمانے میں ابن عاشور کی علمی و فکری خدمات کے وسیع پیمانے پر تعارف کا کریڈٹ اسلامائزیشن آف نالج کے علم بردار مشہور عالم اسلامی تھنک ٹینک ''المعہد العالمی للفکر الاسلامی'' واشنگٹن ڈی سی کو جاتا ہے، جس کو مخفف نام IIIT کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اِس ادارے نے ابن عاشور کی کئی کتابوں کے انگریزی میں تراجم شائع کرائے اور ان کی خدمات و شخصیت کا تعارف کرایا۔

محمد الطاہر ابن عاشور تیونس میں 1879ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک اندلسی نژاد متمول گھرانے سے تھا۔ اِس خاندان میں صدیوں سے علم و فکر کی روایت چلی آتی تھی۔ اگرچہ ان کے والد کا شمار بڑے علما میں نہیں ہوتا، تاہم ان کے دادا (جو انھی کے ہم نام ہیں) محمد الطاہر بن عاشور

(1815ء-1868ء) اپنے وقت کے تیونس کے بڑے علما میں شمار کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ان کے نانا شیخ عزیز بوعاشور (1825ء-1907ء) بھی بڑے عالموں میں سے تھے اور تیونس کے معروف سیاسی رہنما اور مصلح خیر الدین پاشا (1822ء-1889ء) کے قریبی رفقا میں شمار کیے جاتے تھے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ریفارم اور اصلاح و تجدید کے آوازہ کے ماحول میں شیخ ابن عاشور نے آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد 1898ء میں ابن عاشور ''جامع زیتونہ'' میں داخل ہوئے۔ جامعہ ازہر کی قدیم روایت کے پیٹرن پر زیتونہ میں بھی اسلامی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ البتہ اتنا فرق تھا کہ ابن عاشور کو جو اساتذہ ملے، وہ سب قدیم روایت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک اصلاح و تجدید سے متاثر اور اس سے تعلق رکھتے تھے کہ اِس تحریک کے اُس زمانے میں سب سے بڑے ترجمان شیخ محمد عبدہ نے تیونس کا سفر کیا تھا اور وہاں کے علما و فقہا کو اپنی گفتگوؤں اور خطابات سے متاثر کیا تھا۔ زیتونہ میں ابن عاشور کے اہم ترین اساتذہ میں شیخ عمر الشیخ (1826ء-1911ء) اور شیخ سالم بوحاجب (1828ء-1924ء) شامل تھے۔ محنت و توجہ اور پورے انہماک علمی سے ابن عاشور نے روایتی اسلامی علوم کی تحصیل کی اور ان میں اجازہ (رسمی سند) حاصل کر لی، جس کے بعد انھوں نے زیتونہ میں پڑھایا اور وہاں مفتی سے لے کر اس کے شیخ الجامعہ کے مناصب تک پہنچے۔ تدریس کے ساتھ ان کو افتا کی ذمہ داری بھی دی گئی اور 1927ء میں قاضی القضاۃ کے دفتر میں ان کی تقرری ہوئی اور اس کے چند سال بعد ہی 1932ء میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہو گئے، جو اس وقت ملک کا سب سے بڑا علمی منصب ہوتا تھا۔

خانگی زندگی سے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں، اتنا ضرور ہے کہ ان کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی صاحبان علم تھے۔ ایک صاحب زادے کا نام محمد فاضل بن عاشور تھا اور دوسرے بیٹے محمد العزیز بن عاشور۔ انتظامی عہدوں، مناصب کی مصروفیتوں اور درس و تدریس کی ذمہ داریوں کے باوجود ابن عاشور کثرت سے مضامین لکھا کرتے، جو شام، مصر اور تیونس کے اخبارات و مجلات مثلاً مجلہ ''المنار''، ''ہدی الاسلام''، ''مصباح الشرق'' اور ''مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ'' قاہرہ میں شائع ہوتے۔ مقالات و مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر تصنیف کا کام بھی کیا اور تقریباً چالیس کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں، جو عالم عربی میں متداول ہیں:

1۔ تفسیر التحریر والتنویر (پندرہ جلدیں)۔

2۔ کشف المغطا شرح الموطا۔

3۔ النظر الفصیح علی الجامع الصحیح (صحیح بخاری کی شرح)۔

4۔ الیس الصبح بقریب (اسلامی تعلیم پر ایک نظر)۔

5۔ اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام۔

6۔ مالکی فقیہ شہاب الدین القرافی کی کتاب ”شرح تنقیح الاصول“ کی شرح مسمی بہ ”حاشیۃ التوضیح والتصحیح“۔

7۔ مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ۔ موخر الذکر کتاب کا انگریزی ترجمہ عالمی ادارہ برائے فکر اسلامی، یعنی المعہد العالمی للفکر الاسلامی واشنگٹن ڈی سی نے کرا کر شائع کرایا ہے۔ اور مقاصدی مطالعات میں یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

8۔ الوقف وآثارہ فی الاسلام۔

9۔ موجز البلاغۃ۔

10۔ شرح دیوان بشار بن برد۔

11۔ شرح دیوان النابغۃ۔

12۔ شرح معلقہ امرأ القیس۔

13۔ تحقیقات وانظار فی السنۃ والقرآن۔

ان کے علاوہ کئی ادبی کتابوں کی تحقیق کی اور ان پر تعلیقات لکھیں۔ نیز مصر کے شیخ علی عبد الرزاق کی متنازع فیہ کتاب ”الاسلام واصول الحکم“ کا رد بھی لکھا ہے۔ شیخ علی عبد الرزاق کا کہنا تھا کہ اسلام میں کسی طرح کا کوئی سیاسی نظام نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی تھی اور ازہر کے کئی علما نے بھی اس کا جواب دیا تھا۔

اپنے علمی سفر میں ابن عاشور مصر بھی گئے، جہاں 1903ء میں ان کی ملاقات مصلح و مفکر جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ سے ہوئی، جو اس وقت مصر اور پورے عالم عربی میں جدید دینی بیداری (النهضة العربية الدينية) کے علم بردار تھے۔ یاد رہے کہ شیخ محمد عبدہ خود تیونس آئے تھے اور وہاں اپنی گفتگوؤں میں انھوں نے اصلاحِ معاشرہ اور تجدید کی روح پھونکی تھی۔ ابن عاشور نے محمد عبدہ کی مجالس اور تحریروں سے استفادہ کیا اور وطن میں ہی جس فکر سے

وہ آشنا ہو چکے تھے، اب اس میں اور نکھار پیدا ہو گیا اور جب وہ تیونس لوٹے تو اسلامی بیداری کے نقیب اور علم بردار بن چکے تھے۔

امام ابواسحاق الشاطبی الغرناطی (متوفی 1388ء/790) کی کتاب ”الموافقات“ 1883ء میں پہلی بار تیونس سے چھپی۔ اس کتاب نے ابن عاشور پر گہرا اثر ڈالا اور انھوں نے اسی سے تحریک پا کر ”مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ“ لکھی، جس کے ذریعے سے اسلامی مطالعات میں ایک نئے ڈسکورس کا آغاز ہوا اور علم مقاصد الشریعہ کے نام سے ایک نیا ڈسپلن ارتقا پذیر ہوا، جو آج نشو و نما پا کر اسلامی فقہ کی ایک ناگزیر شاخ بن چکا ہے اور اس کا بڑا کریڈٹ، جیسا کہ اوپر گزرا، عالمی ادارہ برائے فکر اسلامی واشنگٹن کو جاتا ہے، جس نے شاطبی اور ابن عاشور کے علاوہ دوسرے علما و محققینِ شریعت کی اس موضوع پر کتابیں بڑے پیمانے پر شائع کیں اور مختلف زبانوں میں، خاص طور پر انگریزی و اردو میں ان کے ترجمے کرائے اور علما و فقہا کے سامنے نئے آفاقِ علم روشن کیے۔ آج مختلف فقہی اکیڈمیاں اس موضوع پر غور و فکر کر رہی ہیں اور نئی تحقیقات و مطالعات سامنے آ رہے ہیں۔

ابن عاشور مطالعہ و تحقیق کے رسیا تھے۔ انھوں نے زندگی بھر سوچا، غور و فکر کیا، پڑھا، تحقیق کی اور لکھا۔ کافی لمبی عمر پائی، یعنی 94 سال کی عمر میں 12 / اگست 1973ء بہ مطابق 1393 ہجری کو فوت ہوئے اور اپنے پیچھے علم و فکر اور تحقیق کی وہ میراث چھوڑ گئے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے تیونس میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ان کے تحقیقی کاموں میں کئی ابھی تک منتظر طباعت ہیں۔

وہ لوگ کیا ہوئے کہ سناتے تھے کو بہ کو
اک شہرِ آرزو کی حکایت کبھی کبھی

سید منظور الحسن

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا!

اپریل 2001ء میں جب دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چندے آفتاب، چندے ماہ تاب کہا گیا۔ بیبیوں نے بلائیں لیں، بزرگوں نے دعائیں دیں۔ مٹھائیاں بانٹیں، دعوتیں کیں، صدقے اتارے۔ مالک کا دل و جان سے شکر ادا کیا کہ اُس نے ایک بار پھر اولاد کی نعمت سے نوازا ہے۔ سوچا کہ دونوں جب آنگن میں کھیلیں گی تو اللہ کی رحمت کا خوب نظارہ ہو گا۔

اِسی سرشاری میں تین چار ماہ گزر گئے۔ پھر ایک دن مریم کو بخار ہوا اور ساتھ ہی تشنج کی کیفیت طاری ہو گئی۔ فوراً ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے انجکشن دے کر کہا کہ اگر کل تک بخار ختم نہ ہوا اور جھٹکے نہ رکے تو کمر سے کچھ پانی نکال کر ٹیسٹ کریں گے۔ تاہم، اگلے روز طبیعت بحال ہو گئی۔ ایک دو ماہ مزید گزرے تو معمول کے معائنے میں ڈاکٹر نے بتایا کہ بچی کے سر کی نشوونما اُس رفتار سے نہیں ہو رہی، جس رفتار سے ہونی چاہیے۔ پھر ایک دن کسی نے توجہ دلائی کہ مریم کی بینائی کچھ کم زور لگ رہی ہے۔ ماننے کو جی تو نہ چاہا، مگر جب غور سے دیکھا تو کچھ اندیشہ پیدا ہو گیا۔ ماں گلوگیر ہو گئی: ”ہائے، میری بیٹی کو اتنی چھوٹی عمر میں عینک لگ جائے گی!“

آئی اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ چند دن تک تشخیص کرنے کے بعد اُس نے بتایا کہ آنکھیں تو بالکل ٹھیک ہیں، مگر اِس کے باوجود دیکھ نہیں پا رہیں۔ اُس نے ”الشفا آئی ٹرسٹ ہسپتال“ لے جانے کا مشورہ دیا۔ فوراً اسلام آباد پہنچے۔ اُنھوں نے تصدیق کی کہ بینائی نہیں ہے۔ سنتے ہی دنیا اندھیر ہو گئی۔ زمین و آسمان سیاہ ہو گئے۔ یوں لگا جیسے مریم کی نہیں، ہماری آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہے۔ دل پاش پاش ہو گیا۔ آنکھوں سے سیلاب امڈ آیا۔ واپس پہنچ کر ڈاکٹر کو بتایا تو اُس نے کہا کہ بہتر ہے کہ سماعت کا ٹیسٹ بھی کرا لیں۔ ٹیسٹ کرایا تو وہاں بھی آنکھوں والا مسئلہ درپیش تھا۔ یعنی کان ٹھیک تھے، مگر سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی دیکھنے سے محرومی کا رونا جاری تھا کہ سننے سے محرومی کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

پھر چائلڈ نیورو فزیشن کے پاس پہنچے۔ اُس نے سی ٹی اسکین اور کچھ اور ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا کہ مریم سریبرل پالسی (Cerebral palsy) کا شکار ہو چکی ہے۔ پیدایش کے دوران میں یا اُس کے بعد کسی موقع پر دماغ کو آکسیجن پہنچنے میں وقفہ آیا ہے، جس کی وجہ سے دماغ کے بعض حصے معطل ہو گئے ہیں۔ آنکھوں اور کانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تو بصارت اور سماعت کا کام کر رہے ہیں، مگر دماغ اُن کی تصویروں اور آوازوں کو وصول کرنے سے قاصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی بیٹی عمر بھر کے لیے معذور ہو گئی ہے۔ اب یہ نہ دیکھ سکے گی، نہ سن سکے گی، نہ بول سکے گی۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی صلاحیتیں بھی وقت کے ساتھ کم ہوتی جائیں گی۔ لیکن جہاں تک تکلیفوں اور مشکلوں کا تعلق ہے تو اُن میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہ تقدیر کا فیصلہ تھا، جسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ خدا کی توفیق شامل حال ہوئی اور ہم نے اِس مقدر کو پورے دل و جان سے قبول کر لیا۔ ایک دوسرے کو تسلی دی کہ بیٹی کی یہ چند روزہ تکلیف اُس کی ابدی راحت کی ضمانت ہے۔ جب اللہ کی عنایت سے وہ ہمیشگی کی جنت میں داخل ہو گی تو اعتراف کرے گی کہ اللہ نے اُس کے حق میں بہترین فیصلہ کیا ہے۔ اُسے دنیا کی پر خطر آزمایش سے محفوظ کر کے ایسی سکونت عطا فرمائی ہے، جس میں دکھ، تکلیف، غم، پریشانی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بس آرام ہی آرام اور قرار ہی قرار ہے اور اِس کے ساتھ ایسی نعمتیں ہیں، جنھیں نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اُن کا خیال کبھی گزرا ہے۔

یہ امر واقعی تھا اور اطمینان کا باعث تھا۔ مگر اِس کی نوعیت آسمانی حقیقت کی تھی، جو فی الحال

آنکھوں سے اوجھل تھی۔ زمینی حقیقت جو روبرو تھی، وہ یہ تھی کہ مریم کو اب ایک ایسی زندگی بسر کرنی ہے، جس میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ہو گی؛ چار جانب گھٹاٹوپ اندھیرا ہو گا، نہ صبح کا پتا چلے گا، نہ شام کا؛ دنوں، مہینوں اور سالوں کا شمار بے معنی ہو جائے گا؛ اِس تیرگی کے ساتھ ہر سو مہیب سناٹا ہو گا، جو عمر بھر طاری رہے گا۔ گویا ایسی زندگی ہو گی، جس پر موت کا گماں ہو گا یا پھر ایسی موت ہو گی، جو زندگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو گی۔

مریم نے اگلے 23 سال موت و حیات کے اِسی برزخ میں بسر کیے۔ اِس دوران میں وہ کس کرب سے گزری یا اُس نے کیا صدمے اٹھائے، ہم بالکل نہیں جان سکے۔ ہم تو بس اُتنا ہی جان سکے، جتنا اُس نے اظہار کیا۔ وہ کبھی خوش گوار اور پر سکون ہوتی، کبھی بہت بے چین ہو جاتی۔ کبھی کھلکھلا اٹھتی اور کبھی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگتی۔ اُسے بس ایک ہی لفظ آتا تھا: ''ماما''۔— شاید ابتدائی برس میں بڑی بہن سے سنا ہو اور یاد رہ گیا ہو یا محض بے شعوری کی مہمل آواز ہو۔ — بے اختیاری میں کبھی اچانک پکارتی: ''ماما، ماما''۔ ماں قریب جا کر پیار کرتی اور پوچھتی: ''کیا ہوا ہے میری بیٹی کو؟ بھوک تو نہیں لگی؟ کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟ خواب میں ڈر تو نہیں گئی؟ میں کیا کروں اپنی بیٹی کے لیے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو بتاؤ...!'' جواب میں اکثر گمبھیر خاموشی ہوتی یا کبھی ایک دو آنسو گالوں پر ڈھلک جاتے۔ ہم جان لیتے کہ خاموشی اور آنسوؤں کی زبانی اپنا عذر بتا رہی ہے:

دل کے زخم کا رنگ تو شاید آنکھوں میں بھر آئے
روح کے زخموں کی گہرائی کیسے دکھائیں تمھیں؟
سناٹا جب تنہائی کے زہر میں بجھتا ہے
وہ گھڑیاں کیونکر کٹتی ہیں، کیسے بتائیں تمھیں؟
دیپک راگ ہے چاہت اپنی، کاہے سنائیں تمھیں؟
ہم تو سلگتے ہی رہتے ہیں، کیوں سلگائیں تمھیں؟*

گذشتہ پانچ چھ سالوں سے اُس کی مشکلوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نمونیے کے بار بار حملوں سے

---

*ظہور نظر

پھیپھڑے پوری طرح بحال نہیں رہے تھے۔ اِس لیے ناک کے ذریعے سے پیٹ میں نالی ڈالی گئی تھی، جس سے تھوڑا سا دودھ پلا دیا جاتا تھا۔ اِس کی الجھن بہت تکلیف دہ تھی۔ یہ تکلیف اُس وقت انتہائی بے چینی میں بدل جاتی، جب نالی نکال دینے کے ڈر سے اُس کے دونوں ہاتھ باندھنے پڑ جاتے۔ اِس کے ساتھ کبھی قے، کبھی اینٹھن، کبھی جلد کا مسئلہ، کبھی سانس میں دشواری، کبھی تشنج، کوئی نہ کوئی مشقت ہر وقت طاری رہتی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اُس نے اِن سب مشقتوں اور مشکلوں کو اِس طرح قبول کیا، جیسے اِنھی کا نام زندگی ہے اور اِنھیں خوشی خوشی جھیلنا ہی اُس کا اصل کام ہے۔

وہ اِس بے کیف اور پُر درد زندگی سے کبھی بے زار اور مایوس نہیں ہوئی۔ ہمیشہ زندہ رہنے کی جدوجہد کرتی رہی۔ گذشتہ پانچ سالوں کا معمول تھا کہ ہر سال نمونیے کا حملہ ہوتا، ہسپتال میں داخل کیا جاتا، ڈاکٹر کہتے کہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیے، آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ہم بہ صد رنج ڈاکٹروں کی بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتے۔ مگر وہ اِسے ماننے سے صاف انکار کر دیتی۔ پھر روح و بدن کی پوری طاقت لگا کر زندگی کی جنگ لڑتی اور بالآخر یہ جنگ جیت جاتی۔ ڈاکٹر حیران ہوتے کہ جسم نے ناقابل یقین حد تک سروائیول کی جدوجہد کی ہے۔ 2019ء سے 2023ء تک ہر سال یہ عمل دہرایا جاتا رہا۔ ہر بار نمونیے کا حملہ ہوتا، ہر بار ڈاکٹر موت کا یقین دلاتے، ہر بار وہ موت سے جنگ لڑتی اور ہر بار اُسے شکست دے کر زندگی کی بازی جیت جاتی۔

اُس کی ہمت نے ہمیں بھی ہمیشہ حوصلہ مند رکھا۔ اللہ کی توفیق اور اعزہ و احباب کی تسلی کی بہ دولت لمحہ بھر کو بھی کبھی مشکل کا احساس نہیں ہوا۔ 2024ء میں جب میں عمر کے انسٹھویں (59) سال میں داخل ہوا تو محسوس ہوا کہ قویٰ میں اضمحلال کے وہ آثار پیدا ہونے لگے ہیں، جو کہن سالی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ مریم کو نہلاتے دھلاتے ہوئے، اٹھا کر سیڑھیاں اترتے چڑھتے ہوئے، وہیل چیئر پر یا گاڑی میں بٹھاتے اتارتے ہوئے اندازہ ہونے لگا کہ اب ناتوانی غالب آ رہی ہے۔ دل و جان سے ارادہ کیا کہ اِس کم ہمتی کو مریم کے سامنے بالکل ظاہر نہیں ہونے دینا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پریشان ہو جائے اور ہمت ہار دے۔ یہ کوشش دو تین ماہ تک پوری کامیابی سے جاری رہی، مگر اُس کے بعد پے در پے کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ ہمت و حوصلے کا سارا بھرم کھل گیا۔ اُسے پتا چل گیا کہ باپ کے لیے محبت و شفقت کے تقاضوں کو نبھانا اب مشکل ہو گیا ہے۔ بس

پھر کیا تھا، فوراً رختِ سفر باندھ لیا۔ چہرے پر غم، افسوس اور ناراضی کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔ انجان بن کر پوچھا کہ کیا ہوا میری بیٹی کو؟ فوراً منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عین اُسی لمحے کہیں دور سے یہ آواز سنائی دی:

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے*

ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ حسبِ سابق نمونیے کا حملہ ہوا ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہ کون سی نئی بات ہے۔ اِس سے پہلے بھی پانچ مرتبہ یہی کہا گیا ہے، مگر وہ ایسی بہادر ہے کہ ہر مرتبہ زندگی کی بازی جیت لیتی ہے۔ اِس بار بھی جم کر لڑے گی اور جیت جائے گی۔ یہ خیال خام تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر کے آئی تھی کہ اب کی بار اُس نے نہیں لڑنا اور زندگی کی بازی کو ہار دینا ہے۔ لہٰذا جب جگر لہو ہونے لگا تو اُس نے اُسے لہو ہونے دیا، دل رکنے لگا تو رکنے دیا، سانسیں اکھڑنے لگیں تو اُنھیں اکھڑنے دیا۔

میں نے سمجھایا کہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں، تمھارے چھوٹے چھوٹے سے تو کام ہیں، اِنھیں کرنے میں کچھ بھی مشکل نہیں ہوتی، بلکہ راحت ملتی ہے، زندگی کی طلب پیدا ہوتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر تم چلی گئی تو کافی مشکل ہو جائے گی، اِس لیے کہ پھر ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ بہن بھائی نے منتیں کیں کہ ابھی ٹھہر جاؤ، پھر بعد میں چلی جانا، ابھی تو ہم نے بھی تم کو سنبھالنا ہے۔ ماں نے دہائی دی: مریم، مریم، ہم تمھارے دم سے زندہ ہیں، ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ، تمھارے بغیر ہم کہاں جائیں گے، کیسے جی پائیں گے؟ سب کی التجائیں سن کر تھوڑا سا بے قرار ہوئی، مگر پھر جلد ہی مطمئن ہو گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن۔ چہرے پر مگر، اُس کرب کی جھلک نمایاں تھی، جو اُس کی روح اور اُس کے بدن نے 23 سال تک سہا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں میں ہماری التجاؤں کا یہ جواب بھی نقش تھا:

زندہ رہیں تو کیا ہے، جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

---

*شان الحق حقی

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں، جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا
اب کون منتظر ہے ہمارے لیے یہاں*
شام آگئی ہے، لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا**

---

*بہ ادنیٰ تصرف

**منیر نیازی

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

ترا وجود نظر کی تلاش میں ہے ابھی
یہ خاک اپنے شرر کی تلاش میں ہے ابھی

پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کارواں اپنا
اگرچہ رختِ سفر کی تلاش میں ہے ابھی

افق سے ڈھونڈ کے لائی تھی آرزو جس کو
وہ آفتاب سحر کی تلاش میں ہے ابھی

تری نوا میں کمالِ ہنر تو ہے، پھر بھی
ذرا سے خونِ جگر کی تلاش میں ہے ابھی

سمجھ ہی لے گا حقیقت سے آشنا ہو کر
زمانہ فوقِ بشر کی تلاش میں ہے ابھی

حضورِ عشق میں آئی تو ہے خرد، لیکن
وہاں بھی نفع و ضرر کی تلاش میں ہے ابھی

مرا غزال سوادِ ختن میں آ پہنچا
سنا ہے اپنے ہی گھر کی تلاش میں ابھی

اِسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے رازداں پیدا

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[مارچ 2025ء]

”غامدی صاحب: ایک شاگرد کی نظر میں“

یہ حسن الیاس صاحب کے پوڈ کاسٹ کا عنوان ہے، جو انھوں نے شمس الدین حسن شگری صاحب کے ساتھ ریکارڈ کرایا۔ اس پوڈ کاسٹ میں حسن الیاس صاحب نے اپنی ابتدائی طالب علمانہ زندگی کے احوال پر گفتگو کے ساتھ ساتھ غامدی صاحب کے ساتھ اپنے علمی و فکری سفر کی روداد بیان کی ہے۔ غامدی صاحب کی نجی زندگی پر بات کرتے ہوئے انھوں نے ان کی شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو بیان کیا اور بتایا کہ بہ طور والد اور استاد وہ کن خوبیوں کے حامل ہیں۔ مزید برآں، فکر فراہی کی بنیاد، نظریات اور غامدی صاحب کے علمی و فکری مقام کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اس پوڈکاسٹ کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔

”اصول تکفیر“

گذشتہ ماہ محمد طلحہ علوی صاحب نے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری آن لائن سیمینار ”وائس

آف ریسرچ" میں "اصول تکفیر" کے موضوع پر گفتگو کی۔ اس سیمینار میں زیر بحث آنے والے اہم نکات یہ ہیں: "مسئلۂ تکفیر پر اہل علم کی مختلف فقہی آرا"، "جاوید احمد غامدی صاحب کا تصور تکفیر"، "ریاست کا حق تکفیر"، "اللہ اور رسول کا حق تکفیر"، "تکفیر کے مذہبی و سماجی اثرات" اور "مسئلۂ تکفیر اور جماعت احمدیہ"۔ دل چسپی رکھنے والے حضرات ان سیمینارز میں براہ راست شرکت کرکے اپنے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

"اسلام اور ریاست"

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں "اسلام اور ریاست" کے زیر عنوان اگلے موضوع کا آغاز کیا گیا ہے۔ گذشتہ ماہ اس موضوع پر منعقد ہونے والی نشستوں میں غامدی صاحب نے اسلام اور ریاست کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ مزید برآں، فرد، معاشرے، سیاست اور ریاست سے متعلق دینی احکام پر بھی گفتگو کی گئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"حدیث و سنت اور تصوف"

گذشتہ ماہ غامدی صاحب نے جناب شمس الدین حسن شگری کو طویل دورانیے پر مبنی انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو کو "حدیث و سنت اور تصوف" کا عنوان دیا گیا، جس میں حدیث و سنت کی تعریف، حجیت حدیث، منکر حدیث، تصوف اور وحدت ادیان سے متعلق اہم سوالات کو زیر بحث لایا گیا۔ اس انٹرویو کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

"رؤیتِ باری تعالیٰ — غامدی صاحب کا موقف"

منظور الحسن صاحب نے اپنے اس مضمون میں معراج کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے دیدار الٰہی سے متعلق غامدی صاحب کے موقف کو بیان کیا ہے۔ علما کے دو مختلف نقطہ ہاے نظر بیان کرنے کے بعد قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے استقام کی نشان دہی کی ہے۔ غامدی صاحب کا موقف بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ معراج کی روایت میں چونکہ بالکل

صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات باری کا مشاہدہ رؤیا کے عالم میں کیا تھا، اس لیے اس کو قرآن مجید کے اُن نصوص کے خلاف قرار نہیں دیا جاسکتا، جو باری تعالیٰ کی رؤیت بصری کے امکان کو رد کرتے ہیں۔ اس مضمون کو ماہنامہ ”اشراق امریکہ“ کے فروری 2025ء کے شمارے میں پڑھا جاسکتا ہے۔

”سوال وجواب حسن الیاس کے ساتھ“

غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن حسن الیاس صاحب نے معروف یوٹیوب چینل ”مسلم ٹوڈے“ کے ساتھ ”Ask Hassan Ilyas“ کے نام سے ایک پروگرام کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ سوال وجواب پر مبنی پروگرام ہے، جس میں حسن الیاس صاحب حاضرین کی جانب سے پوچھے گئے علمی وفکری اور دینی سوالات کے جواب دیتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس پروگرام میں باغ فدک، مسئلۂ تقدیر، سنت، انکار حدیث، خلافت کا احیا، اتمام حجت اور حدیث عمار کے متعلق سوالات کو زیر بحث لایا گیا۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

”تفہیم الآثار“ سیریز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ”تفہیم الآثار“ سیریز کے زیر عنوان آثار کی شرح و وضاحت کا سلسلہ جاری ہے۔ فروری 2025ء میں ”تفہیم الآثار“ سریز میں زیر بحث آنے والے آثار میں جن اہم نکات پر بات کی گئی، وہ یہ ہیں: ”قرآن مجید کو نزاع اور جدال کی بنیاد بنانا“، ”علم کے بغیر تفسیر قرآن کی سنگینی“، ”قرآن مجید کی محکم اور متشابہ آیات“، ”علم قرآن کی جستجو“، ”قرآن مجید کے مضامین اور قرآن کا ظاہر و باطن“۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

غامدی سینٹر کی آن لائن خانقاہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری آن لائن خانقاہ کا سلسلہ جاری ہے۔ معز امجد صاحب ہر ہفتے اصلاحِ نفس کے پہلو سے اس کی ایک نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں لوگوں کے نفس کی اصلاح

اور تربیت کے حوالے سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی منعقد ہونے والی نشستوں میں "غیر متواضع ہونے کی لطیف علامتیں"، "انسان کی حس جمالیات"، "انسان کی کوشش کا نتیجہ خیز ہونا" اور "نماز مشکل میں کیسے مدد کرتی ہے؟" جیسے اہم نکات پر گفتگو کی گئی۔ آن لائن خانقاہ کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

Ask Ghamidi

یہ سوال وجواب کی آن لائن نشست ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے دینی اور اخلاقی موضوعات سے متعلق مختلف سوالوں کے جوابات براہ راست غامدی صاحب سے حاصل کر سکیں۔ ہر ماہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس نشست میں حصہ لیتی ہے۔ فروری 2025ء میں اس نشست میں لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: "کیا دنیا میں قتل کی سزا پانے والے کو آخرت میں بھی اس کی سزا ملے گی؟"، "سورۂ مومنون کی آیت 6 میں کن لونڈیوں کی طرف اشارہ ہے؟" اور "پیداوار پر 5 فی صد اور 10 فی صد زکوٰۃ کی تعیین کا کیا معیار کیا ہے؟"۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

"البیان" کی انگریزی زبان میں تدریس

شہزاد سلیم صاحب غامدی صاحب کی تفسیر "البیان" کی انگریزی زبان میں تدریس کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں تاکہ انگریزی جاننے والے حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ فروری 2025ء میں انھوں نے سورۂ نساء کی آیات 104 تا 152 کا انگریزی زبان میں درس دیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

"تقسیم ہند اور مولانا اصلاحی"

نعیم احمد بلوچ صاحب "حیات امین" کے عنوان سے مولانا امین احسن اصلاحی کی سوانح قلم بند

کر رہے ہیں، جسے "اشراق امریکہ" میں سلسلہ وار شائع کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں انھوں نے تقسیم ہند کے حوالے سے مولانا اصلاحی کے موقف کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک مسلم ہندو کی بحث فضول اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ البتہ، جب پاکستان بن گیا تو انھوں نے جماعت اسلامی کے مرکزی حصے کا ساتھ دیتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ جماعت اسلامی کو اپنی جدوجہد کا محور اب پاکستان ہی کو بنانا چاہیے۔

غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال وجواب کی نشستیں

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ہفتے سوال وجواب کی لائیو نشست منعقد کی جاتی ہے، جس میں حسن الیاس صاحب غامدی سینٹر کو موصول ہونے والے مختلف نوعیت کے سوال غامدی صاحب کے سامنے رکھتے ہیں اور غامدی صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ فروری 2025ء میں منعقد ہونے والی ان نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: "غامدی صاحب امریکہ کی مذمت کیوں نہیں کرتے؟"، "باغ فدک: سیدنا ابو بکر کا فیصلہ"، "دین خاموش ہے سے کیا مراد ہے؟"، "کیا فکر فراہی روایت کے اندر کھڑی ہے؟"، "کیا ہم جنس پرستی فساد فی الارض ہے؟" اور "کیا تہذیبی روایت طاقت کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے؟"۔ سوال وجواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

"اسلام اسٹڈی سرکل"

ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب "اسلام اسٹڈی سرکل" کے عنوان سے ہر ماہ ایک سیشن کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس میں وہ مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے کے سیشن میں "اللہ کی پناہ"، "اعمال صالحہ"، "خود کو برتر سمجھنا" اور "باقاعدگی سے ادا کی جانے والی نمازیں" جیسے

موضوعات زیر بحث رہے۔ یہ سیشن انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ اس سیشن کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“

”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“ دنیا نیوز چینل پاکستان کا ایک معروف پروگرام ہے، جو کئی برس سے نشر ہو رہا ہے۔ یہ ڈیلس میں ریکارڈ ہوتا ہے اور ہفتہ وار نشر ہوتا ہے۔ میزبانی کے فرائض غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن حسن الیاس صاحب انجام دیتے ہیں۔ فروری 2025ء میں ”مکتبِ فراہی کے فکری حاصلات“ کے عنوان سے 4 پروگرام ریکارڈ کیے گئے اور دنیا نیوز سے نشر ہوئے۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

”مبادی تدبر قرآن“

شہزاد سلیم صاحب ”میزان لیکچرز سیریز“ کے تحت غامدی صاحب کی کتاب ”میزان“ کی انگریزی زبان میں تدریس کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ انھوں نے اس سیریز کے تحت ”مبادی تدبر قرآن“ کے موضوع پر انگریزی زبان میں دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان لیکچرز کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 3 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

شہزاد سلیم صاحب 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں اب تک کے زیر بحث آنے والے تمام موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''غنا اور موسیقی'' کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان پروگرامز کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں وہ لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

سنڈے اسکول میں پریزنٹیشن ڈے کا انعقاد

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے زیر اہتمام چلنے والے سنڈے اسکول میں گذشتہ ماہ پریزنٹیشن ڈے کا انعقاد کیا گیا، جس میں طلبہ، والدین اور کمیونٹی کے اراکین سمیت 150 سے زائد افراد نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے انعقاد کا مقصد طلبہ کو مختلف صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دینا تھا۔ طلبہ نے مختلف اسلامی موضوعات پر بات کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ اس پروگرام میں اٹھارہ ٹیموں نے حصہ لیا، جن میں سے آٹھ ٹیموں کو بہترین کارکردگی پر انعامات دیے گئے۔ پریزنٹیشن ڈے کی کامیابی طلبہ، اساتذہ اور والدین کی تعلیم سے محبت اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ گہری وابستگی کو ظاہر کرتی اور اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ایسے پروگرام ذہنی نشوونما اور کمیونٹی کے ساتھ تعلق کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔